طلوع اسلام

اپریل ۱۹۵۱

بہ یاد اقبال

8

فرمانِ خدا

(فرشتوں سے)

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

حق را بسجودے صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

تہذیب نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

(اقبال)

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام
کراچی

قیمت فی پرچہ	مرتب	بدل اشتراک
آٹھ آنے (پاکستانی)	محمد یونس	سالانہ چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۴ — اپریل ۱۹۵۱ء — نمبر ۴

فہرستِ مضامین

فرمانِ خدا (اقبال)	۱	مقام تشکر	۵۰
لمعات	۸ - ۳	اقبال (نظم) (آقائے صادق سرمد)	۵۲ - ۵۱
خلافتِ اسلامیہ (اقبالؒ)	۲۱ - ۹	سلیم کے نام ... (پرویز صاحب)	۶۵ - ۵۳
جاوید نامہ (اسلم جیراجپوری صاحب)	۲۹ - ۲۲	اقبال کا تصور علم (ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب)	۷۳ - ۶۶
علامہ اقبال سے آخری ملاقات (پرویز صاحب)	۳۵ - ۳۰	یوم اقبال (اسد صاحب ملتانی)	۷۴
دینِ اقبال (عرشی صاحب)	۴۶ - ۳۶	یوم اقبال پر چند خیالات	۷۶-۷۵
گلِ اقبال نگہ بہاریں (ممتاز حسن صاحب)	۵۰ - ۴۷	دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا	۷۸-۷۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پچھلے دنوں ایک نجی مجلس میں اقبال کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے کہا کہ اقبال کے ہاں "مشرق" اور "مغرب" کے الفاظ اکثر ملتے ہیں۔ معلوم نہیں ان سے اس کا مفہوم کیا ہے۔ اتفاق سے طلوع اسلام زیر نظر شمارہ بیشتر اقبال سے متعلق مضامین ہی پر مشتمل ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی موضوع پر گفتگو کی جائے۔

اقبال کے ہاں مشرق یا مغرب سے مفہوم کوئی خاص خطۂ زمین نہیں۔ ان سے مفہوم زندگی کے دو جداگانہ تصورات (Ideologies) ہیں۔ مشرق کو آپ دیکھئے تو اس میں آپ کو ایک چیز خاص طور پر نمایاں نظر آئے گی۔ قرآن نے جن انبیاء کرام کا ذکر کیا ہے وہ سب مشرق میں پیدا ہوئے۔ بلکہ یوں کہئے کہ یہ سب کے سب سامی النسل تھے۔ قرآن نے یہ ضرور کہا ہے کہ ان انبیاء کے علاوہ جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے، مختلف اقوام میں اور انبیاء بھی آتے رہے، لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ صرف مشرقی اقوام ہی ہیں جو اپنی تعلیم کو انبیاء کی طرف منسوب کرتی ہیں، یا یوں کہئے کہ اپنے ہاں کے نوشتوں کو آسمانی کتابیں کہہ کر پکارتی ہیں۔ مغرب کی کسی قوم کا یہ دعویٰ نہیں کہ ان کے ہاں کوئی نبی آیا تھا یا ان کے ہاں کوئی تعلیم ایسی ہے جس کا سرچشمہ ذہنِ انسانی سے ماورا ہو۔ ہم اس بحث میں نہیں جانا چاہتے کہ ان اقوام میں فی الواقع کوئی رسول آیا تھا یا نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی تاریخ نے اپنے دامن میں کسی رسول کا ذکر محفوظ نہیں رکھا۔ نہ ہی وہ اقوام اپنی تعلیم کو کسی رسول کی طرف منسوب کرتی ہیں۔ یورپ میں یہودیت اور عیسائیت عام ہے لیکن ان دونوں مذاہب کے رسول مشرقی ہیں، مغربی نہیں۔ لہٰذا مشرق کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ وحی کی قائل ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب سرزمین مشرق ہی کی پیداوار ہیں۔ لہٰذا یوں کہئے کہ اقوام مشرق مذہب پرست ہیں۔ مذہب میں ایک طرف کسی بالاہستی کا تصور ناگزیر ہوتا ہے اور دوسری طرف کسی نہ کسی شکل میں موت کے بعد کی زندگی کا عقیدہ بھی۔

اس کے برعکس مغرب کو لیجئے۔ وہاں یا تو فلسفہ کارفرما رہا ہے اور یا عصرِ حاضر میں طبیعیات کی بنیادوں پر پیدا شدہ تصوراتِ زندگی۔ فلسفہ ہو یا طبیعیات، دونوں کا سرچشمہ ذہنِ انسانی ہے۔ یہ ماورائے سر حدِ ادراک کے قائل ہی نہیں۔ ان کے ہاں علوم کا دائرہ محسوسات میں گھرا ہوا ہے۔ وہاں تمام مسائلِ حیات کا حل تنہا عقل کی رو سے تلاش کیا جاتا ہے۔ عقل ہمیشہ وقت کی مصلحتوں کے تابع چلتی ہے، اس لئے مختلف اوقات اور مختلف حالات میں عقل کے فیصلے مختلف ہوتے ہیں۔ اسلئے یوں کہئے کہ مغرب کی دنیا میں

مستقل اقدار کا کوئی تصور نہیں۔ وہاں صرف تقاضائے مصلحت (Expediency) فیصلے کا معیار قرار پاتا ہے۔ وہاں یا تو کسی بالاہستی کا تصور ہی نہیں ملتا، اور اگر ملتا ہے تو صرف ایسے خدا کا جو کائنات کی مشینوں کو ایک دفعہ کوک دیکر الگ ہو بیٹھا ہے، اور اب یہ مشینری قوانینِ فطرت کے مطابق خود بخود چلے جا رہی ہے۔ اگر وہ لوگ اس سے ذرا آگے بڑھتے ہیں تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ خدا انہی قوانینِ فطرت کا نام ہے، اور چونکہ قوانینِ فطرت دنیائے محسوسات ہی سے متعلق ہیں، اس لئے خدا بھی انہی چار دیواریوں میں گھرا ہوا ہے۔ زندگی مادی اجزاء میں ایک خاص ترتیب سے پیدا ہو جاتی ہے اور اس ترتیب کے منتشر ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا انسانی اعمال کا تعلق اسی دنیا تک ہے۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔

یہ ہیں وہ متضاد تصورات حیات اور نظریاتِ زندگی جن کی مظہر مشرق اور مغرب ہیں۔ اقبال جب مشرق کہتا ہے تو اس سے اس کی مراد یہی تصورات زندگی ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ تصورات مختلف اقوام مشرق میں مشترک ہی کیوں نہ ہوں، لیکن کہیں یہ بالکل خالص اور غیر ملوث شکل میں ہیں، اور کہیں ان میں ذہن انسانی کی آمیزشیں بھی ہو چکی ہیں۔ یہ اپنی اصلی اور غیر ملوث حالت میں صرف قرآن کے اندر باقی رہ گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر مقام پر ان میں انسانی تصورات کی آمیزش ہو چکی ہے۔ اس لئے اقبال جب مشرق کا نام لیتا ہے تو اس سے اس کا حقیقی مفہوم قرآن ہی کی تعلیم ہوتا ہے۔ اور یہی وہ تعلیم ہے جسے وہ مغربی تصورات حیات کے مقابلہ میں لاتا ہے، اور انہیں چیلنج دیتا ہے کہ وہ اس کے مقابل میں انسانی زندگی کے مسائل کا حل پیش کریں۔ ایک مرتبہ ایک نجی صحبت میں حضرت علامہ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا تھا جب انھوں نے اس سوال کے جواب میں کہ تمام انبیاء مشرق ہی میں کیوں آئے مغرب ہی میں کیوں نہیں آئے، اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں فرمایا کہ بات یوں تھی کہ روزِ ازل جب خدا اور ابلیس میں جھگڑا ہوا ہے تو ان دونوں نے اپنے اپنے ملک بانٹ لئے تھے۔ مشرق کو خدا نے لے لیا اور مغرب ابلیس کے حصے میں آگیا۔ یہ ہے وہ مقام جہاں اقبال مغرب کے مقابلے میں ہمیشہ مشرق کی برتری ثابت کرتا ہے۔ یہ برتری درحقیقت عقلِ انسانی کے تراشیدہ نظام ہائے زندگی کے مقابلہ میں قرآنی نظامِ زندگی کی برتری کے مترادف ہوتی ہے۔ اقبال کا سارا پیغام اس برتری کا نقیب ہے اور اس کو عام کرنے کے لئے اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اس کی فکر کا ماحصل عقل کے مقابلے میں عشق کی فضیلت اور فوقیت ثابت کرنا ہے اور عشق سے اس کی مراد وحی خداوندی ہوتی ہے۔ عقل یعنی مغرب ہی کا دوسرا نام اس کے نزدیک تہذیب فرنگ ہے۔ دیکھئے کہ وہ "پیامِ مشرق" میں (جو کہ درحقیقت وحی پر مشتمل پیغام ہے) "فرنگ" کے نام کیا پیغام دیتے ہیں:-

از من اے بادِ صبا گوئے بدانائے فرنگ — عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
برق را این بہ جگر می زند آں رام کند — عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تر است
چشم جز رنگِ گل و لالہ نہ بیند ورنہ — آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است

دانش اندوختہ دل ز کف انداختہ　　آہ زاں نقد گراں مایہ کہ در باختہ

ذرا آگے چل کر کہتے ہیں:

عقل خود بیں دگر و عقل جہاں بیں دگر است　　بال بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است
دگر است آں سوئے نہ پردہ کشادن نظرے　　ایں سوئے پردہ گمان و ظن و تخمیں دگر است
اے خوش آں عقل کہ پیمائے دو عالم با اوست　　نور افروختہ و سوز دل آدم با اوست

لیکن اقبال کے ہاں مشرق اور مغرب سے ایک مفہوم اور بھی ہے اور اس مفہوم کے لئے بھی، اقبال نے ان اصطلاحات کو جا بجا استعمال کیا ہے۔ مشرق کو تعلیم تو وحی کے ذریعہ سے ملی لیکن اس نے اس تعلیم کو اس درجہ مسخ کر دیا کہ ان کی نگاہوں سے زندگی کا مقصود ہی اوجھل ہو گیا۔ ان کے ہاں حقائق کی جگہ اشخاص پرستی نے لے لی۔ دین کے نظامِ زندگی کی جگہ دھرم (مذہب) کی رسومات آ گئیں۔ عقل و فکر کی جگہ اندھی تقلید نے لے لی۔ قوائے فکریہ کے ساتھ ہی ان کے قوائے عملیہ بھی مفلوج ہو گئے۔ دنیا کی زندگی کو قابلِ نفرت سمجھ کر انھوں نے اپنی توجہ کو اپنے ذہن کی تراشیدہ اخروی زندگی پر مرکوز کر دیا۔ اور اس زندگی سے مفہوم اپنی موہوم امیدوں کے علاوہ کچھ نہ سمجھا۔ نتیجہ یہ کہ تمام اقوام مشرق رفتہ رفتہ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئیں۔

ان کے مقابل میں مغرب نے ہر سامنے آنے والے معاملہ کو علم اور عقل کی رو سے جانچا اور اس کا عملی حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔ قوانین فطرت کے مطالعہ اور اشیائے فطرت کے مشاہدے سے انھوں نے قوائے فطرت کو ایک ایک کر کے مسخر کر لیا۔ انھوں نے زمین پر جال بچھا دیئے، پانیوں پر اپنی حکومت قائم کر لی، فضا کی پہنائیوں پر مسلط ہو گئے اور اپنی ان قوتوں سے ساری دنیا پر چھا گئے۔ ان کے ہاں کمی رہ گئی تو فقط یہ کہ ان کے پاس مستقل ضابطۂ حیات ایسا نہ تھا جس سے انسانی معاشرے میں توازن قائم رکھ سکتے۔

اقبال کے ہاں مشرق سے دوسرا مفہوم وہی پژمردگی اور افسردگی، بیکسی اور بے بسی، محکومی اور ناامیدی، تقلید و جمود اور بے حسی اور بے عملی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مغرب سے مفہوم بے باک قوتیں اور بے ضبط طاقتیں ہوتا ہے۔ اس مقام پر وہ مشرق اور مغرب دونو پر سخت تنقید کرتا ہے۔ وہ برملا کہتا ہے کہ

مشرق ہمہ افسانہ مغرب ز تو بیگانہ　　وقت است کہ در عالم نقش دگر انگیزی

اقبال کے پیغام میں جہاں جہاں مشرق کی تنقیص ہے، وہ اس تصورِ حیات پر تنقید ہے جس نے ان سے زندگی کی حرارت چھین کر ان کی دنیا کو مردوں کی بستی بنا رکھا ہے۔ اقبال کے نزدیک نہ مشرق کے یہ انداز صحیح ہیں، نہ مغرب کا وہ اسلوب۔ اس کے نزدیک صحیح نظامِ زندگی عقل اور عشق کے امتزاج کا نام ہے یعنی دنیا کو وحی کی روشنی میں عقل کی آنکھ سے دیکھنے کا نام۔ اس کے لئے وہ مشرق اور مغرب دونوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

کہ خیز و نقش عالم دیگر بنہ   عشق را با زیرکی آمیز دہ

اور یہ قرآن کے پیغام کی صحیح تفسیر ہے۔ اس کے نزدیک مردانِ مومن کی تعریف یہ ہے کہ کل الالباب الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلیٰ جنوبھم۔ یعنی ارباب عقل ودانش جو اٹھتے، بیٹھتے، پلٹتے، ہر وقت اپنے سامنے وحی کے محکم قوانین کو رکھتے ہیں، اور انہی کی روشنی میں اپنی عقل سے کام لے کر اپنے زمانے کے تقاضوں کا حل تلاش کرتے ہیں۔ اقبال دنیا میں اس قسم کے انسان دیکھنا چاہتا تھا اس لئے وہ مغرب والوں سے کہتا تھا کہ وہ مشرق سے وحی کا تصور لے لیں اور مشرق والوں سے کہتا تھا کہ وہ مغرب والوں سے عقل کی باتیں سیکھیں۔ اقبال کا جہانِ نو وہی تھا جس میں ہر کام عقل اور وحی کے اسی حسین امتزاج سے طے پائیں اور اس طرح مشرق اور مغرب کی حدود مٹ کر الارض للہ کا منظر عام ہو جائے۔ اسی میں وہ فوز و فلاح انسانیت کا راز دیکھتا تھا، اور اسی میں وہ قیام آدمیت کا امکان پاتا تھا۔

اقبال کی وفات کو تیرہ برس ہوگئے۔ جس قوم کو اقبال نے اتنا کچھ دیا اس قوم سے پوچھئے کہ اس نے ان تیرہ برس میں اقبال کے پیام کی نشر و اشاعت کے لئے کیا کیا۔ یا جن تصوراتِ حیات کو عام کرنے کیلئے اس نے اپنے آپ کو اس طرح پھونک ڈالا تھا، ان تصورات کو عملاً متشکل کرنے کے لئے کیا کچھ ہوا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اقبال کا مقبرہ بھی بن گیا، اس کا کلام قوالوں نے ڈھولکیوں پر گایا، آرٹسٹوں نے ریڈیو سٹیشنوں سے براڈکاسٹ کیا۔ ہر سال ملک کے اطراف و اجانب میں ایک مرتبہ یوم اقبال بھی منائے گئے — نہیں ایک قدم اور آگے بڑھئے، خود حکومت نے ایک مرتبہ ایک لاکھ روپیہ بھی ادا کیا (اگرچہ اس حکومت کو اقبال کی یادگار میں ایک دن کی تعطیل کی توفیق نصیب نہ ہوئی)۔ اس روپے کے بل بوتے پر اقبال اکیڈیمیاں بھی قائم ہوئیں — ایک کراچی میں اور ایک لاہور میں — لیکن اس سب کچھ ہونے کے بعد اگر پوچھا جائے کہ اس تمام ہاؤ ہو کے بعد آج تک ہوا کیا۔ تو اس کا جواب سوائے ایک کھسیانی سی ہنسی کے اور کچھ نہیں مل سکتا۔ سچ کہا تھا اس نے

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا   یہ اک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

اور کچھ تو چھوڑیئے، اس وقت تک کوئی ایک کتاب ایسی نہیں لکھی گئی جسے یہ کہہ کر پیش کیا جا سکے کہ اس سے اقبال کے پیغام کی حقیقت سمجھ میں آسکے گی۔ اگرچہ کاروباری دنیا میں دیکھئے تو ہر پبلشر کی زبان پر اقبال کا نام نظر آئے گا، اور ہر ڈسٹ کور پر اقبال کی تصویر۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح عام مسلمانوں کو یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ قرآن نے انہیں کس قدر گراں بہا متاع عطا کر دی ہے، اس سے ان کا مقام کتنا بلند ہو سکتا ہے، اسی طرح پاکستان کے مسلمانوں نے سمجھا ہی نہیں کہ قرآن کے اس مفسر اقبال نے انہیں کیا کچھ دے دیا ہے۔ آپ پاکستان کا مقابلہ افغانستان، ایران، عراق، حجاز، فلسطین، شام، مصر، وغیرہ سے کیجئے۔ آپ

دیکھیں گے کہ یہاں کے مسلمانوں کی فکر باقی تمام مسلمانانِ عالم سے کہیں بلند ہے۔ اگر اسے خودستائی نہ سمجھا جائے تو یہ کہنے کی بھی اجازت دیجئے کہ جو کچھ طلوعِ اسلام میں پیش ہو رہا ہے اس کی مثال آپ کو تمام عالمِ اسلامی میں کسی کتاب یا کسی مجلہ میں نہیں مل سکے گی۔ آپ کو معلوم ہے کہ مسلمانانِ پاکستان کے فکر کی یہ بلندی کس کے رہینِ کرم ہے؟ یہ صرف فکرِ اقبال کے تصدق میں ہے۔ جس نے یہاں کے مسلمانوں میں قرآن کے بھولے بسرے پیغام کو از سرِ نو تازہ کر دیا۔ جس طرح انسانی زندگی کے مسائل کا حل قرآن کی روشنی میں ہم سوچ سکتے ہیں، باقی عالمِ اسلامی اس نہجِ فکر سے قطعاً ناآشنا ہے۔ آپ ان کا لٹریچر پڑھئے، یا ان کے بڑے بڑے مشاہیر سے باتیں کر کے دیکھئے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی فکری سطح کیا ہے۔ اس میں ہماری کوئی خوبی نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مبدءِ فیض کی کرم گستری نے یہاں اقبال پیدا کر دیا۔ اقبال کے فکر کو اپنی تاریخ سے الگ کر دیجئے اور پھر دیکھئے کہ آپ بھی کس طرح اس پستی میں جا گرتے ہیں جہاں دیگر اسلامی ممالک کے باشندے ہیں۔ اس چیز کو خود یہاں آزما کر دیکھئے جو لوگ فکرِ اقبال سے شناسا نہیں وہ مکتب کے ملّا ہوں یا تہذیبِ نَو کے فرزند فکری اعتبار سے بالکل کورے نظر آئیں گے۔ یہ صرف اقبال کی نورِ بصیرت کا صدقہ ہے کہ ہمارے ظلمت کدہ میں روشنی کی جگمگاتی ہوئی کرنیں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ اقبال کا اتنا بڑا احسان ہے کہ جس سے کوئی قلب حساس عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہماری احسان ناشناس قوم ہے کہ اس نے اقبال کی زندگی میں اسے اس کسمپرسی کے عالم میں چھوڑ دیا اور اس کے مرنے کے بعد ڈھولکوں، مشاعروں اور اکیڈیمیوں کے بلند آہنگ دعاوی کے علاوہ اس کے پیغام کو عام کرنے کیلئے کوئی قدم نہ اٹھایا۔ معلوم نہیں ہمیں اس کفرانِ نعمت کی سزا کیا ملے گی۔ اقبال کے کلام سے چشم پوشی درحقیقت قرآن کے پیغام سے پہلوتہی ہے۔ اور جو قرآن سے پہلوتہی کرتا ہے اسے دنیا میں کبھی عزت کی زندگی نصیب نہیں ہو سکتی، خواہ ظاہر املکتوں اور حکومتوں کی نظر فریبیاں ان میں جھوٹی عزت کی کتنی ہی تابناکیاں کیوں نہ پیدا کر دیں۔ یہ سب جھوٹے نگوں کی میناکاری ہے۔ وللہ العزۃ جمیعاً ولرسولہ وللمومنین۔ حقیقی عزت اجتماعیت اور مرکزیت کو قوانینِ الٰہیہ سے وابستہ کر دینے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

زندگی میں بعض سانحے ایسے ہو جاتے ہیں کہ ان کے متعلق یہ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ وہ کیسے وقوع پذیر ہو گئے۔ اسی قسم کا ایک حادثہ مارچ کے مہینے میں طلوعِ اسلام کے ساتھ پیش آیا۔ ٹائیٹل پر یہ اعلان چھاپنا مقصود تھا کہ آئندہ یعنی اپریل کا پرچہ اقبال نمبر ہو گا۔ چنانچہ مناسب عبارت لکھ کر پریس کو چھپنے کے لئے دے دی گئی، لیکن جب ٹائیٹل چھپ کر تیار ہو کر ہمیں ملا تو "اقبال" کے ساتھ "Poet" (شاعر) کا لفظ دیکھ کر ہماری حیرانی کی انتہا نہ رہی کیونکہ مسودے میں یہ لفظ مطلقاً نہیں تھا۔ اور ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ طلوعِ اسلام نے اقبالؒ کو کبھی شاعر نہیں سمجھا

اوران پر بقول اقبال کبھی "تہمت شعر و سخن" نہیں لگائی۔ بہرحال یہ معمہ بالکل حل نہیں ہو سکا کہ 'شاعر' کا لفظ کس طرح چھپ گیا۔ اور حل ہو بھی جائے تو اس سے طلوع اسلام کا جذبۂ ندامت کم نہیں ہو سکتا۔ طلوع اسلام اس پر جس قدر بھی ندامت کا اظہار کرے کم ہے۔

رکھشا والا

میں اپنی عادت سے مجبور، پھر رکھشا والے سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آجکل آمدنی کا کیا حال ہے۔ اس نے کہا کہ بابوجی! آمدنی کا آپ کیا پوچھتے ہیں۔ صبح سے شام تک انسان سے حیوان بنے رہتے ہیں تب کہیں جا کر چار پانچ روپے بنتے ہیں۔ ان میں سے تین روپے رکھشا کا مالک لیجاتا ہے باقی میں ہم پیٹ کی آگ بجھا لیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اگر تھوڑے تھوڑے پیسے بھی جمع کرتے رہو تو ایک دن یہی رکھشا تمہاری اپنی ہو جائیگی اور تین روپے اور جو مالک کو دینے پڑتے ہیں، تمہارے اپنے ہی پاس رہیں گے۔ اس نے کہا کہ بابوجی! اتنی سمجھ تو ہم بھی رکھتے ہیں لیکن پیسہ بچ کیسے سکتا ہے!

میں اتفاق سے اس کے بھائی کو بھی جانتا تھا۔ میں نے کہا کہ تمہارے بھائی نے کس طرح پیسے جمع کر لئے۔ اسکی بھی اتنی ہی آمدنی ہے اور اتنے ہی جی کھانے والے ہیں۔ وہ مسکرایا اور کہا کہ بابوجی! اس طرح پیسے جمع کرنے بھلا انسان کا کام ہے! ذرا جا کر اس کے بیوی بچوں کی حالت دیکھو۔ نہ کسی کے تن پر کپڑا ہے نہ گھر میں کوئی اوڑھنا بچھونا۔ آٹھ پہر میں ایک وقت روٹی پکتی ہے وہ بھی کسی کو پیٹ بھر کر ملتی ہے کسی کو آدھے پیٹ۔ دو بچے مدرسے جاتے تھے انہیں اٹھا لیا کہ وہ کتابوں کیلئے پیسے مانگتے تھے جس شخص کی اپنی اولاد کے ساتھ یہ کیفیت ہو وہ کسی عزیز، رشتہ دار، دوست کا کیا سنوارے گا۔ وہ اپنا آپ بھی نہیں سنوار سکتا۔ جھونپڑا کسی سے مفت مل گیا تھا اس کی مرمت نہیں کراتا۔ صحن میں اتنی گندگی جمع رہتی ہے چار پیسے بھنگن کو نہیں دیتا۔ بچے بیمار پڑ جاتے ہیں تو کمبخت دو چار آنے کی دوائی نہیں لا کر دیتا۔ اگر اس کے بعد وہ پیسے جمع کر کے اس پر فخر کرتا ہے تو بابوجی! ہم سے تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ پیسے جمع کرنا بہت اچھی بات ہے۔ اس سے لوگوں میں عزت ہوتی ہے لیکن جمع کرنا اسی کو پھبتا ہے جو اپنی اور اپنے بچوں کی تمام ضرورتیں پوری کرنے کے بعد جمع کر سکے۔ اگر ہر ایک ضرورت اپنی اپنی جگہ پڑی رہے تو پھر کون ہے جو جمع کے کھاتے میں پیسے نہیں دکھا سکتا۔ ہم بابوجی! بیوقوف آدمی ہیں۔ آپ بہت سمجھدار دانا ہیں۔ لیکن ہم اتنی بات ضرور کہتے ہیں کہ اپنے پتے چار پیسے دکھانا اسی وقت زیب دیتا ہے جب انسان اپنی سب ضرورتیں پہلے پوری کر لے۔ بچوں کو بھوکے اور ننگے رکھکر شیخی دیکھارنا کہ ہمارے پاس . . . .

اتنے میں صدر کا چوک آگیا، یہاں بیحد شور ہو رہا تھا جس میں رکھشا والے کی باقی بات سنائی نہ دی۔ زیادہ شور اخبار بیچنے والوں کا تھا جو چلا چلا کر کہہ رہے تھے:

پاکستان کا شاندار کارنامہ!

اس سال کے بجٹ میں اٹھائیس کروڑ کی بچت!!

خلافتِ اسلامیہ

از علامہ اقبالؒ

مترجمہ چودھری محمد حسین ایم۔ اے (مرحوم)

(علامہ اقبالؒ کا یہ مضمون، ان کی وفات سے بہت پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ اصل مضمون انگریزی میں تھا جس کا ترجمہ چودھری محمد حسین مرحوم نے کیا۔ ہم اسے ترجمہ کی بعض لفظی اصلاحات اور بعض غیر متعلقہ حصوں کے حذف کے بعد شائع کر رہے ہیں۔ طلوع اسلام)

عرب جاہلیت اور طریق انتخاب رئیس

زمانۂ جاہلیت میں ملکِ عرب کئی مختلف قبائل پر منقسم تھا جو ہمیشہ باہمدگر برسرِ پیکار رہتے تھے۔ ہر قبیلہ کا اپنا جداگانہ سردار، جداگانہ معبود اور جداگانہ شاعر ہوتا تھا۔ شاعر کا جذبہ حبِ قومی اپنے قبیلہ کے اوصاف و فضائل کی شان و عظمت کو منصۂ شہود پر لانے میں صرف ہوتا تھا اگرچہ ان ابتدائی اجتماعی نظاموں میں ایک خاص حد تک باہمی تعلقات قائم تھے تاہم یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیادت اور آنحضرتؐ کے دین کی عالمگیرانہ حیثیت کا کرشمہ تھا کہ امارت و ریاست کے وہ تمام منتہا و مقاصد جن کیلئے ہر قبیلہ ساعی و سرگرداں رہتا تھا حرفِ غلط کی طرح اعراب کے صفحۂ ضمیر سے محو و مفقود ہو گئے اور جھونپڑوں اور خیموں میں زندگی بسر کرنے والے ایک مشترک و وسعت طلب نظام میں بصورت ملتِ واحدہ جلوہ نما ہونے لگے۔ اس حقیقت کو واضح تر کرنے کیلئے ہمارے پیش نظر مباحث اس امر کے مقتضی ہیں کہ ہم شروع ہی میں عرب قبائل کے مراسم وراثت و دستور جانشینی کے تمام پہلوؤں کو بالتفصیل بیان کر دیں، اور اس نظام اور ضابطہ کا ذکر کر دیں جو کسی سردار قبیلہ کی وفات کے وقت قبیلہ کے ارکان کو ملحوظ رکھنا ہوتا تھا۔

جب کسی عرب قبیلہ کا سردار یا شیخ مر جاتا تو قبیلہ کے تمام اکابر ایک جگہ جمع ہوتے اور ایک دائرہ کی شکل میں مجلس منعقد کر کے جانشینی کے معاملہ پر بحث و تمحیص کرتے۔ قبیلہ کا کوئی رکن جس کو معتبر و مقتدر خاندانوں کے اکابر و رؤسا، باتفاق رائے منتخب کر دیں وہ قبیلہ کا رئیس بن سکتا تھا۔ بقول واں کریمر، وراثتی بادشاہت کا مفہوم عرب دل و دماغ سے ہرگز مانوس نہ تھا۔ ہاں کبرسنی و بزرگی کا اصول جسکو موجودہ سلطنت ترکی کے نظامِ حکومت میں سلطان احمد اول کے زمانہ میں قانوناً تسلیم کر لیا گیا، یقیناً انتخاب کے وقت منتخب کرنے والوں کو ملحوظ رکھنا پڑتا تھا۔ اگر کبھی یہ مشکل آپڑتی کہ قبیلہ کا ایک حصہ ایک سردار کی حمایت میں ہو اور دوسرا نصف دوسرے کی حمایت

میں تو دونوں فریق اسوقت تک کہ ایک امیدوار اپنے حقوق سے دست بردار نہ ہو جائے ایک دوسرے سے جدا رہتے ورنہ بصورتِ دیگر شمشیر فیصلہ کرتی۔ جو سردار اس طرح منتخب ہوتا قبیلہ کو اختیار تھا کہ اگر اس کی روش کو جادۂ اعتدال سے منحرف پائے تو اسے معزول کر دے۔ اسلام کے ظہور کے بعد جوں جوں عرب فتوحات کا سلسلہ بڑھتا گیا نظر و تدبر کے دائرے وسعت پکڑتے گئے۔ یہ ابتدائی رسم بتدریج بڑھتے بڑھتے ایک سیاسی اصول میں تبدیل ہو گئی، جس کے وضع کرنے میں جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے، اسلام کے ماہرینِ قانون اساسی نے نئے نئے سیاسی حالات اور تجربوں پر اپنے اجتہاد و تفقہ کی بنا رکھی۔

اسلام و دستورِ انتخابِ خلیفہ

پیغمبرِ عرب صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کی اس قدیم رسم کو قائم رکھا۔ رحلت کے وقت یا اس سے قبل اپنی جانشینی کے متعلق مسلمانوں کو کوئی ہدایات نہ فرمائیں۔ ایک حدیث میں مروی ہے کہ بڑھا طفیل ابن عامر ایک دن پیغمبرِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ "اگر میں اسلام قبول کر لوں تو مجھے کیا مرتبہ یا منصب دیا جائے گا؟ کیا آپ اپنے بعد عرب کی حکومت کی باگ میرے ہاتھ میں دیدیں گے؟" رحمۃ اللعالمینؐ نے جواب دیا "حکومت کی باگ تو خود میرے ہاتھ میں نہیں، تیرے ہاتھ میں کیا دونگا"۔ یہی وجہ تھی کہ خانہ جنگی کے خطرہ سے بچنے کیلئے حضرت ابوبکر کا انتخاب جو آنحضرتؐ کے خسر اور اکابر اصحاب میں سے تھے، فوراً ہوا۔ اپنے انتخاب اور تقرر کے بعد حضرت ابوبکرؓ مجمع میں کھڑے ہوئے اور مسلمانوں کو مخاطب کر کے پہلا خطبہ ان الفاظ میں دیا۔

> یا معشر الناس! آج سے میں تمہارا حکمراں ہوں اگرچہ تم سب میں قابل ترین نہیں ہوں۔ اگر میں شریعت کے مطابق عمل کروں تم میری مدد کرو اور میرا ہاتھ بٹاؤ۔ اگر شریعت کے خلاف جاؤں مجھے روکو اور میری اصلاح کرو۔ حق کی اطاعت کرو کیونکہ حق ہی میں ہدایت و ایمان ہے۔ باطل سے بچو کیونکہ باطل ضلالت و منافقت کا سرچشمہ ہے۔ تم میں سب سے زیادہ کمزور میری آنکھوں میں سب سے زیادہ قوی ہوگا جب تک کہ میں اس کی شکایات کو رفع نہ کر دوں، تم میں سب سے زیادہ قوی میری آنکھوں میں سب سے زیادہ کمزور ہوگا تا آنکہ میں اس سے وہ حق چھین نہ لوں جو اس نے غیر کا غصب کیا ہے۔ جو اللہ کی راہ میں جہاد کو ترک کریگا خدا اسے ذلیل کر دیگا تم میری اطاعت کرو لیکن اس وقت تک جب تک کہ میں خدا اور رسول کی اطاعت کرتا رہوں۔ جس معاملہ میں خدا و پیغمبرؐ کی اطاعت سے انحراف کروں تم میری اطاعت ترک کر دو۔

یہ سب سے پہلا انتخاب تو اس طریق پر ہوا لیکن اس کے بعد جب حضرت عمرؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو آپ نے اس اہم مسئلہ پر اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کی کہ "حضرت ابوبکرؓ کا فوری انتخاب اگرچہ ضروریاتِ وقت و نتائج کے لحاظ سے نہایت مناسب اور برمحل ہوا تاہم انتخاب کا یہ طریق مذہب اسلام میں اصول مسلمہ قرار نہیں دیا جا سکتا"۔ چنانچہ ڈوزی کی کتاب (جلد اول ص۱۲۱) میں آپ سے منقول ہے کہ "وہ انتخاب جو لوگوں کی جزوی رائے کے اظہار سے عمل میں آیا ہو، منسوخ و مسترد سمجھنا چاہیئے"۔

ان باتوں پر غور کرتے ہوئے ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام ابتدا ہی میں اس اصول کو تسلیم کر چکا تھا کہ فی الواقع اور عملاً

سیاسی حکومت کی کفیل و امین ملتِ اسلامیہ ہے نہ کہ کوئی خاص فردِ واحد۔ انتخاب کنندگان جو کچھ اس معاملہ میں کرتے ہیں اس کے معنی صرف یہی ہیں کہ وہ اپنے متحدانہ و آزادانہ عمل انتخاب سے اس سیاسی حکومت کو ایک ایسی مختصر و معتبر شخصیت میں ودیعت کر دیتے ہیں جس کو وہ اس امانت کا اہل تصور کرتے ہیں۔ یوں کہو کہ تمام ملت کا ضمیر اجتماعی اس ایک فرد یا شخصیت منفردہ کے وجود میں عمل پیرا ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حقیقتاً اور صحیح معنوں میں فرد، تمام کی تمام قوم کا نمائندہ کہلا سکتا ہے۔ لیکن ایسے فرد کا مسندِ حکومت پر متمکن ہونا شریعت کے نزدیک اُسی کسی برتری یا ترجیح کا مستحق ہرگز نہیں بناتا۔ شریعت حقہ کی نگاہ میں اس کی شخصی و ذاتی حیثیت بالکل وہی رہے گی جو ایک عام دوسرے مسلمان کی ہے۔ اس کو ان افراد پر جن کا وہ نمائندہ ہے سوائے اس حکومت کے جو شرعاً آئین کے نافذ کرنے کی غرض سے اسے حاصل ہے، اور کوئی اختیار و اقتدار نہ ہوگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب اسلام میں "قانونِ اساسی" کی بنیاد و شریعت کے تصریحی احکام کے بعد مسائل کا حل تمام تر اتفاق و اتحادِ آرائے جمہور ملت کے بنیادی اصول پر قائم ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کے انتقال کے بعد حضرت عمرؓ جو حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں قاضی القضاۃ کے عہدہ پر مامور تھے، تمام قوم کے اتفاق رائے سے خلیفہ منتخب ہوئے۔ ۶۴۴ء میں آپ ایک ایرانی غلام کے ہاتھوں مہلک طور پر زخمی ہوئے اور رحلت سے قبل اپنی جانشینی کی نامزدگی کا اہم کام سات انتخاب کنندگان کے سپرد کیا۔ ان سات میں آپ کا اپنا فرزند ارجمند بھی شامل تھا۔ ان سات حضرات کے ذمہ جب یہ مہتم بالشان فرض کیا گیا تو یہ شرط ساتھ ہی عائد کر دی گئی کہ انتخاب مکمل اتفاق آرا پر مبنی ہوگا اور خود تم سات میں سے کوئی شخص خلافت کا امیدوار یا دعویدار نہ ہوگا۔ حضرت عمرؓ کا خود اپنے فرزند کو خلافت کی امیدواری سے مستثنیٰ رکھنا کس قدر روشن اور جلی ثبوت ہے اس حقیقت کا کہ اس زمانہ تک عرب کے سیاسی دل و دماغ کو وراثتی بادشاہت کے خیال سے قطعاً بُعد و مغائرت تھی۔

بایں ہمہ حفظِ ماتقدم، اس مجلس کا قرعہ مجلس ہی کے ارکان میں سے ایک پر پڑا اور حضرت عثمانؓ خلیفہ منتخب کئے گئے۔ یہی حضرت عثمانؓ کی خلافت آگے چل کر خلافت جیسے اہم مسئلہ میں اختلاف کا موجب ہوئی۔ شہادت عثمانؓ کے بعد مذہب کے پردے میں تین بڑے سیاسی گروہ پیدا ہو گئے جنھوں نے جدا جدا اپنے سیاسی مسلمات اختراع کر لئے۔ ان میں سے جب کبھی کوئی گروہ برسر اقتدار و حکومت ہوا، سلطنت عرب کے کسی نہ کسی صوبہ میں اس نے اپنے وضع کردہ سیاسی اصولوں کو رائج کرنے اور کامیاب بنانے کی کوشش کی۔ مگر پیشتر اس کے کہ ہم ان اصولوں کی تشریح و تنقید پر قلم اٹھائیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ناظرین کی توجہ مفصلہ ذیل دو نکات کی طرف مبذول کی جائے۔

(۱) جمہوریہ اسلامیہ کی بنا شریعت حقہ کے نزدیک ایک مطلق و آزاد مساوات پر قائم ہے۔ شریعت کے نزدیک کوئی گروہ، کوئی ملک، کوئی زمانہ فائق و مرجح نہیں۔ اسلام میں کوئی مذہبی پیشوائی یا مشیخیت نہیں۔ ذات پات، یا نسل و وطن کا امتیاز نہیں۔

پیغمبر عالمؐ آخری زمانے میں ایک روز منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا:

اے مسلمانو! اگر میں نے کبھی تم میں سے کسی کو اپنے ہاتھ سے مارا ہو تو یہ لو میرا بدن آج تمہارے سامنے موجود ہے تم مجھے پیٹ لو۔ اگر تم میں سے کسی کو میرے ہاتھ سے کوئی نقصان یا ضرر پہنچا ہو تو تم اس نقصان کے بدلے آج مجھے نقصان پہنچا لو۔ اگر میرے ذمہ کسی کا مال بطور قرضہ یا بطور امانت ہو تو آج میری تمام پونجی تمہارے سامنے حاضر ہے۔ ہر شخص کو اختیار ہے جو کچھ اس کو مجھ سے لینا ہے وہ لے لے۔

حاضرین میں سے ایک شخص اٹھا اور کہا "آپ کے ذمہ میرے تین درہم قرض ہیں"۔ رحمتِ عالمؐ نے جواب دیا کہ "میں اس دنیا میں شرمسار ہوں گا مگر آخرت کی سرخروئی کو ہاتھ سے نہ دوں گا"۔ اور اسی وقت اس شخص کا مطلوبہ قرض ادا کر دیا۔ شریعت حقہ نسلی یا قومی امتیازات کو جو بظاہر قدرتی سے معلوم ہوتے ہیں، ہرگز تسلیم نہیں کرتی۔ نہ ہی قومیت کے تاریخی اختلافات اس کے نزدیک کوئی وقعت رکھتے ہیں۔ اسلام کا سیاسی منتہا یہ ہے کہ تمام نسلوں اور قوموں کے آزادانہ اتحاد و اختلاط سے ایک نئی جامع فضائل و کمالات قوم پیدا کی جائے۔ مذہبِ اسلام میں سیاسی ترقی کا معراج نسلی یا ملکی قومیت نہیں۔ اور یہ اس بنا پر کہ ملتِ اسلامیہ کے عام اساسی اصول فطرت انسانی پر مبنی ہیں نہ کہ کسی خاص قوم کے خصوصیاتِ نسلی پر۔ ایسی قوم کا اندرونی ربط و ضبط کسی نسلی یا جغرافی اتحاد پر قائم نہیں ہو سکتا، نہ ہی زبان اور تمدنی روایات و تجارب پر۔ بلکہ اگر ہو سکتا ہے تو مذہبی اور سیاسی منتہاؤں کے اتحاد و ارتباط پر۔ یا از روئے نفسیات، سینٹ پال کے الفاظ میں "یکجہتی و ہم خیالی" پر۔ پیدائش، شادی، وطنیت وغیرہ کوئی اس قسم کی شرط یا تمیز ایسی قوم میں شمولیت کے مانع نہیں ہو سکتی۔ جب بھی کوئی فرد اس قوم کے دائرہ میں داخل ہوگا اس کو اس "ہم خیالی و یک جہتی" کا اقرار باللسان کرنا ہوگا۔ جب کبھی اس "ہم خیالی" سے قدم پیچھے ہٹائے گا، اسی وقت قوم کے ساتھ رشتۂ اتحاد منقطع سمجھا جائے گا۔ پھر ایسی عالمگیر قوم کا وطن بھی تمام صفحۂ عالم ہی ہونا چاہئے۔ عربوں نے یونانیوں اور ارمنوں کی طرح اپنی فتوحات کے بل پر ایسی عالمگیر قوم یا سلطنت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اسوقت بیشک وہ بھی اس مقصد کے حاصل کرنے میں قاصر رہے۔ تاہم اس منتہا کا حصول ناممکنات سے نہیں۔ بالقوۃ تو اس قسم کی جامع کمالات ملت پیشتر ہی سے اس دنیا میں موجود ہے۔ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، زمانۂ حال کی سیاسی جماعتوں کی زندگی کا نشو و نما زیادہ تر آئین و حکومت کے مشترک اصولوں پر مبنی ہو رہا ہے۔ یہ مختلف و متعدد نظام آئے دن اس طریق پر وسعت پکڑ رہے ہیں اور ایک دوسرے سے قریب ہوتے جاتے ہیں کہ بالآخر کسی وقت ایک دوسرے میں جذب و مربوط ہو کر ایک ہی صورت و شکل میں رونما ہوں۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ایسے عالمگیر نظام کا قائم ہونا انفرادی سلطنتوں کے حقوق اقتدار کے منافی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا نتیجہ یہ مترتب ہوا کہ ایسے نظام کے تعمیر کی بنیاد دنیا کی مادی قوتوں پر کھڑی نہیں ہوگی۔ اس کا تمام تر دارومدار ایک منتہائے مشترک و واحد کی روحانی قوت پر ہوگا۔

(۲) از روئے شریعتِ محمدیہ مذہب و سیاست میں کوئی تفریق و تمیز نہیں۔ گویا ہمارے نزدیک مذہب و حکومت کے یکجا

جمع کرنے کا نام سیاست نہیں بلکہ سیاست وہ عنصر غالب و منفرد ہے جس میں اس قسم کے فرق و امتیاز کی گنجائش ہی نہیں۔ یہ لابد نہیں کہ خلیفۃ المسلمین اسلام کا افضل ترین مذہبی پیشوا سمجھا جائے۔ سطح دنیا پر اس کی نائب خدا کی حیثیت نہیں۔ وہ معصوم نہیں بشر ہے اور دوسرے بشر کی طرح گناہ و خطا کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ اس کی شخصیت بھی شریعت وحی کی ازلی و ابدی حکومت کے اسی طرح ماتحت ہے جس طرح اور باقی مسلمانوں کی۔ غرضکہ شخصی حکومت کا مفہوم اسلام کی حقیقی سپرٹ کے خلاف ہے۔ پیغمبر عرب فداہ ابی و امی نے عربوں جیسی پوری قوم کی قوم کو اطاعت و اقتدار کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ لیکن خود اپنے ذاتی اقتدار و حکومت کی مخالفت، تمام دنیا سے بڑھ کر خود آپ نے کی۔ ارشاد فرمایا:

میں بھی ایسا ہی بشر ہوں جیسے تم سب ہو تمہاری طرح میری مغفرت بھی خدا ہی کے رحم و کرم پر موقوف ہے۔

حدیث بیان کی جاتی ہے کہ ایک دفعہ کسی روحانی جذبہ کے زیر اثر آپ نے اپنے اصحاب میں سے ایک کو فرمایا جاؤ اور لوگوں سے کہدو کہ جس شخص نے ایک دفعہ بھی زندگی میں اپنی زبان سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہدیا وہ سمجھ لے کہ جنت میں داخل ہو گیا۔ رسالتمآبؐ نے کلمۂ توحید کے دوسرے جزو یعنی محمد رسول اللہ کا جس کے اقرار کے بغیر مسلمان مسلمان نہیں ہو سکتا، دانستہ ذکر نہ فرمایا اور اقرار توحید ہی کو کافی سمجھا اور یہ جانتے ہوئے کہ کیوں ایسا کیا محض اس لئے کہ دوسرے جزو میں اپنی ذات اقدس کا ذکر تھا[1] رسول خدا کے اس عمل کی اخلاقی اہمیت کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس پاک ہستی کے اوصاف و خصائل سے واقف ہیں۔ اخلاقیاتِ اسلام

---

[1] یہ حدیث یوں مروی ہے:

ایک مرتبہ حضورؐ ایک باغ میں تشریف فرما تھے کہ آپؐ کے پاس (حضرت) ابوہریرہؓ جا پہنچے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جاؤ، جو شخص ملے اسے یہ بشارت دیدو کہ جس نے لا الہ الا اللہ کہدیا وہ جنت میں داخل ہو گیا۔ ابوہریرہؓ وہاں سے واپس آئے تو سب سے پہلے (حضرت) عمرؓ ابن خطاب سے دوچار ہوئے اور انھیں وہ بشارت سنائی۔ حضرت عمرؓ نے (حضرت) ابوہریرہؓ کو زور سے تھپڑ رسید کیا۔ ابوہریرہؓ بھاگ کر حضورؐ کے پاس پہنچے۔ عمرؓ بھی پیچھے پیچھے تھے۔ ابوہریرہؓ درد کی شدت سے رو رہے تھے۔ حضورؐ نے واقعہ پوچھا اور پھر عمرؓ سے دریافت کیا کہ اسے کیوں پیٹا ہے۔ کہا، کیا آپ نے کلمہ پڑھ دینے پر جنت کی بشارت دی ہے؟ فرمایا ہاں! کہا، آپ ایسا نہ کریں مبادا لوگ سست ہو جائیں۔ انھیں عمل کرنے دیجئے۔ فرمایا، بہت اچھا۔ ہم لوگوں کو عمل کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ (صحیح مسلم)

یہ حدیث جس پائے کی ہو سکتی ہے وہ خود متن سے ظاہر ہے۔ علاوہ ازیں حضرت علامہؒ نے اس سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، اجذباتی طور پر وہ بڑا خوش آئند ہے لیکن درحقیقت وہ محض نکتہ آفرینی ہے۔ اس لئے کہ کلمہ کے جس حصہ (محمد رسول اللہ یعنی ایمان بالرسالت) کو خود اللہ تعالیٰ نے جزو ایمان قرار دیا ہو اُسے رسول اللہؐ کس طرح ساقط کر سکتے تھے؟ پھر یہ حقیقت بھی حضرت علامہؒ کی نگہ بصیرت سے اوجھل نہیں تھی کہ اقرار بالرسالت (محمد رسول اللہ) سے محمدؐ بن عبداللہ کی ذات پر ایمان نہیں لایا جاتا، حضورؐ کی رسالت پر ایمان لایا جاتا ہے۔

طلوع اسلام

تمام دارومدار اس واحد مسئلہ پر ہے کہ فرد من حیث الفرد کیا حیثیت رکھتا ہے۔ زندگی کا کوئی طرزِ عمل یا رویہ جو فرد کے آزادانہ ارتقاء و عروج کے راستہ میں حائل ہو، شریعتِ اسلامیہ اور اخلاقیاتِ اسلام کے قطعاً خلاف ہے۔ ہر مسلمان اپنے افعال و اعمال کے لحاظ سے مختار و آزاد ہے بشرطیکہ خلاف قانون وحی اس سے کوئی فعل یا عمل سرزد نہ ہو۔ شریعت اسلامیہ کے اصولوں کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ وہ فطری ہیں اور وحی ربانی پر مبنی۔ باقی فروعات ہیں۔ سو چونکہ ان کو زمانہ کی رفتار کے مطابق کم و بیش تمام دنیاوی امور پر حاوی ہونا ہوتا ہے، اس لئے ان کی تشریح و تصریح فقہائے ملّت[1] کے سپرد کر دی گئی ہے۔ اسلئے یہ نتیجہ اخذ کرنا بالکل درست ہوگا کہ شریعت جس صورت میں کہ وہ نافذ کی جاتی ہے قضاۃ[1] اسلام کی تشریح کردہ و منضبط کردہ شریعت ہے۔ یا یوں کہو کہ نظامِ ملت میں تفصیلی قانون سازی فقیہہ یا قاضی[1] کرتا ہے۔

اس کے بعد اب ہم ان سیاسی مسائل کی توضیح کرتے ہیں جن کی طرف مضمون کے اول حصہ میں اشارہ کیا گیا تھا۔ اس مسئلہ میں اہل السنت والجماعت کا نظریہ ہماری توجہ کا سب سے پہلے مستحق ہے۔

خلافتِ انتخابیہ
مذہبِ اہل السنت والجماعت
خلیفہ اور جمہور مسلمانان

خلفائے راشدین کے زمانہ میں لوگوں کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ خلفاء کی حیثیت عام افراد سے بڑھ کر نہ تھی، ان کو بسا اوقات معمولی کانسٹیبلوں کا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ وشاورھم فی الامر کے موجب خلفاء امورِ سلطنت میں ہمیشہ رسول اللہؐ کے بااثر و مقتدر صحابیوں سے مشورہ کرتے تھے۔ کوئی عدالتی یا انتظامی معاملہ ایسا نہ ہوتا جس میں ان کی رائے نہ پوچھتے۔ اتنا ضرور تھا کہ معاملاتِ مملکت کی سرانجام دہی کیلئے خلیفہ کا ہاتھ بٹانے کیلئے باقاعدہ طور پر کوئی سرکاری وزراء مقرر نہیں تھے۔ بنی امیہ کے زمانہ تک حکومت کا دستور یہی رہا لیکن جس وقت خاندان عباسیہ نے خلافت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی تو خلافت کا مسئلہ عالمانہ طریق پر زیرِ بحث لایا گیا۔ اس مسئلہ کے متعلق سنّی خیالات کو پیش کرتے ہوئے میں زیادہ امام الماوردی کا نقطۂ خیال پیشِ نظر رکھوں گا۔ امام موصوف دستور العمل حکومت پر سب سے پہلے بحث کرنے والے مسلمان فقیہہ ہیں۔ ان کا زمانہ عباسی خلیفہ القادر کا زمانہ تھا۔ آپ نے ملتِ اسلامیہ کو سیاسی نقطۂ خیال سے دو حصوں پر تقسیم کیا ہے:

(اول) انتخاب کنندگان۔

(دوم) امیدوارانِ خلافت۔

آپ کے نزدیک امیدوار خلافت کے لئے ضروری اوصاف و شرائط حسب ذیل ہیں:

---

[1] اس سے مراد خاص افراد نہیں بلکہ اسلامی مملکت کی مقننہ (مجلسِ قانون ساز) ہے۔ طلوع اسلام

(۱) سیرت اخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہو، عادات وخصائل غیر مشتبہ ہوں۔

(۲) صحت حواس ظاہری وباطنی قائم ہو۔ (سلطان عبدالعزیز اسی شرط کی عدم موجودگی کی بنا پر معزول کئے گئے)

(۳) مذہب وشریعت کا ضروری علم حاصل ہو۔ جس سے کم از کم خلیفہ اس قابل ہو سکے کہ مختلف نوعیتوں کے مقدمات فیصلہ کر سکے۔ اصولاً یہ شرط معتبر ہے مگر عملاً، خصوصاً آخری زمانہ میں آکر خلیفہ کے مقدمات فیصلہ کرنے کے اختیارات بٹ گئے اور بعض دوسرے عہدہ داروں کو منتقل کر دیئے گئے۔

(۴) امیدوار ایسی دور بینی وحق اندیشی کا مالک ہو جو ایک حکمراں کیلئے ضروری ہے۔

(۵) ایسے حوصلہ اور جرأت کا مرد ہو کہ وقت ضرورت خلافت مقدسہ کی حفاظت کیلئے میدان میں نکل سکے۔

(۶) خاندانِ قریش سے قرابت رکھتا ہو۔

(موخر سنی فقہا کے نزدیک یہ شرط اس بنا پر کہ پیغمبر خدا نے اپنا جانشین خود آپ کسی کو نامزد نہیں کیا تھا، لازمی نہیں)

(۷) پوری عمر کا بالغ ہو (عند الغزالی) یہی شرط تھی جس کی عدم موجودگی میں قاضی القضاۃ نے المقتدر کو خلیفہ منتخب کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

(۸) مرد ہو نہ کہ عورت (عند البیضاوی) اس شرط کا خوارج نے انکار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عورت خلیفہ منتخب ہو سکتی ہے۔

اگر امیدواران شرائط کو پورا کر دے تو پھر تمام بڑے بڑے خاندانوں کے نمائندے۔ اعاظم فقہا۔ حکومت کے اعلیٰ عہدہ داران اور فوج کے سپہ سالار سب ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ان اوصاف کے شخص کو خلیفہ نامزد کرتے ہیں۔ بعد ازاں یہ سارے کا سارا اجتماع جلوس کی شکل میں مسجد میں داخل ہوتا ہے جہاں جمہورِ ملت اس نامزدگی کی باقاعدہ تائید وتصدیق کرتے ہیں۔ دور دراز علاقوں میں منتخب شدہ خلیفہ کے نمائندوں کو اجازت دی جاتی ہے کہ وہ منجانب خلیفہ عام لوگوں سے بیعت لیں۔ دار الخلافت کے لوگوں کو انتخاب کے معاملہ میں مفصل کے لوگوں پر کسی قسم کی سبقت حاصل نہیں اگرچہ عملاً کچھ تھوڑی سی اس قسم کی سبقت انھیں اس سبب سے حاصل ہے کہ سابق خلیفہ کی موت کی خبر قدرتاً وہی سب سے پہلے سنتے ہیں۔ بعد انتخاب خلیفہ عموماً ایک خطبہ پڑھتا ہے جس میں یہ عہد کرتا ہے کہ میں شریعتِ اسلام کے مطابق حکومت کروں گا اور کسی حالت میں اس سے اعتدار نہیں کروں گا۔ تاریخ اسلام کے صفحات میں اس قسم کے کئی خطبے محفوظ ہیں۔ اس حقیقت نفس الامری سے یہ واضح ہو گا کہ اسلام نے اصول نمائندگی کو ایک خاص حد تک جائز قرار دیا ہے۔ قانونی نقطۂ خیال سے خلیفہ کی حیثیت کوئی مرجح وممتاز حیثیت نہیں۔ اصولاً وہ بھی جمہوریت کے اور اراکین کی طرح قوم کا ایک عام رکن ہے۔ اس کے خلاف عام عدالت میں مقدمہ دائر کیا جا سکتا ہے جس میں اسے اصالتاً بنفس نفیس حاضر ہونا پڑتا ہے۔ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ پر ایک دفعہ یہ الزام لگایا گیا کہ آپ نے مالِ غنیمت میں اور لوگوں کی نسبت خود زیادہ حصہ لیا ہے۔

اس الزام کے جواب میں خلیفہ کو جمہور کے سامنے اپنے طرزِ عمل کی صفائی دینی پڑی اور شریعتِ اسلامیہ کے مطابق سب کے سامنے اپنی بریت کی شہادت پیش کی۔ ہر مسلمان کو یہ اختیار ہے کہ خلیفہ کی حاکمانہ حیثیت پر آزادانہ نکتہ چینی کرے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک دفعہ ایک بوڑھی عورت نے محض اس بات پر علانیہ زجر و توبیخ کی کہ تو نے قرآن پاک کی فلاں آیت کی غلط تفسیر و تشریح کی ہے۔ اس عالی منزلت خلیفہ نے بڑھیا کے استدلال کو حوصلہ کے ساتھ سُنا اور مقدمہ کا فیصلہ بڑھیا کے بتائے ہوئے معانی کے مطابق کیا۔

خلیفہ کو اختیار ہے کہ اپنا جانشین نامزد کر دے خواہ وہ اس کا اپنا بیٹا ہی ہو لیکن جمہور ملت اس کی تائید نہ کرے تو نامزدگی شرعاً غیر مکمل رہے گی۔ بنی امیہ کے چودہ خلفاء میں صرف چار خلیفے اس کوشش میں کامیاب ہوئے کہ ان کے بعد ان کے بیٹے وارثِ خلافت ہوں۔ خلیفہ کو یہ اختیار ہرگز حاصل نہیں کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے جانشین کو لوگوں سے منتخب کرائے۔ ابن اثیر لکھتا ہے کہ خلیفہ عبدالملک (بنی امیہ) نے اس قسم کے انتخاب کا چارا کیا مگر مکہ کے مشہور فقیہ ابن مصیب نے خلیفہ کے اس طرزِ عمل کے خلاف نہایت بلند آہنگی سے احتجاج کی آواز اٹھائی۔ عباسی خلیفہ الہادی بیشک اس سعی میں کامیاب ہوا کہ اپنی زندگی میں اپنے بیٹے جعفر کو جانشین منتخب کرالے مگر یہ انتخاب عبث و بے معنی تھا۔ کیونکہ اس کی وفات کے بعد لوگوں نے ہارون کو اپنا خلیفہ مقرر کر لیا اور جعفر کی پرواہ تک نہ کی۔ جب صورت حالات اس قسم کی پیدا ہو جائے کہ ایک خلیفہ پہلے منتخب ہو چکا ہو اور جمہور ملت بعد میں ایک دوسرا خلیفہ انتخاب کر لیں تو پھر پہلے منتخب شدہ خلیفہ کو طوعاً و کرہاً اپنے حقوق سے عام پبلک کے سامنے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ اگر ایسا کرنے سے گریز و انکار کرے تو سزائے قتل کا مستوجب ٹھہرایا جاتا ہے۔

اگر خلیفہ شریعت کے مطابق احکام نافذ نہ کرے یا اگر جسمانی یا روحانی اسقام میں مبتلا ہو تو وہ اس قابل ہوتا ہے کہ خلافت اس سے چھین لی جائے۔ خلیفہ کی اس قسم کی معزولی کے وقت عام طور پر جس قاعدہ پر عمل کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی صاحب اثر مسلمان بعد نماز مسجد میں جماعت کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور جماعت کو خطاب کر کے ان تمام براہین و دلائل کو لوگوں پر واضح کرتا ہے جو اس امر کے مقتضی ہوتے ہیں کہ خلیفہ کو مسندِ خلافت سے برطرف کر دیا جائے۔ وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ خلیفہ کی معزولی تائیدِ مقاصدِ اسلام کی بنا پر عمل میں لائی جا رہی ہے نہ کہ اس کے سوا کسی اور غرض کے لئے۔ تقریر ختم کر کے وہ اپنے ہاتھ کی انگوٹھی اتار کر زمین پر دے مارتا ہے اور زبان سے یہ لفظ پکارتا ہے،

"مجھے اس خلیفہ کی معزولی اس طرح مطلوب ہے جس طرح میں نے اپنے ہاتھ کی انگوٹھی کو اتار کر پھینک دیا ہے"۔

بعد ازاں لوگ مختلف طریقوں پر اس تجویز کی تائید کرتے ہیں حتیٰ کہ معزولی کا عمل بالکل مکمل سمجھا جاتا ہے۔

جس طرح امیدوارِ خلافت کے لئے بعض مخصوص اوصاف کا مالک ہونا ضروری ہے اس طرح الماوردی کے نزدیک انتخاب کنندہ کے لئے لازم ہے کہ وہ بھی چند مخصوص اوصاف سے متصف ہو، اور وہ یہ ہیں،

(۱) دیانت داری اسکی معلوم و معروف ہو۔

(۲) امور سلطنت کا ضروری علم اور واقفیت حاصل ہو۔

(۳) دور بینی اور عدل و انصاف کے مادہ سے خالی نہ ہو۔

اصولاً تمام مسلمان مرد و زن کو انتخاب میں رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ صاحب جائیداد ہونا شرط نہیں۔ تاہم عملاً عورتوں اور غلاموں کو اپنے حق کو عمل میں لانے کا کبھی موقعہ نہیں ہوا معلوم ہوتا ہے قرون اولیٰ کے فقہا اس بات میں کچھ خطرہ محسوس کرتے تھے کہ عوام الناس کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہو، یا کبھی عملاً ووٹ دیں۔ کیونکہ یہ تمام فقہا عموماً اس پر زور دیتے ہیں اور انہوں نے اسے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انتخاب اور ووٹ دینے کا حق صرف خاندان پیغمبر تک ہی محدود ہے۔ عام مسلمان انتخاب میں دخل دینے کے مجاز نہیں۔ مگر ہم بالفعل اس معاملہ میں اپنی رائے نہیں دے سکتے کہ عورتوں کو الگ تھلگ رہنے کی پابندی روز افزوں اس لئے ہوئی کہ ان کو حق انتخاب سے محروم رکھا جائے، جس سے اصولاً ان کو محروم نہیں رکھا جا سکتا تھا یا کسی اور غرض کیلئے۔

انتخاب کنندہ کو خلیفہ یا اس کے عاملین کی معزولی کے مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے، بشرطیکہ وہ یہ ثابت کر دے کہ ان کا طرز عمل خلاف شریعت ہے۔ اس کو یہ اختیار ہے کہ بعد نماز مسجد میں تمام حاضرین کو اس موضوع پر خطاب کرے اور اپنے اعتراضات و دعاوی و دلائل کو ان کے سامنے پیش کرے۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مسجد مسلمانوں کی کونسل چیمبر یا دیوان عام ہے۔ مسجد میں نماز باجماعت اور روزانہ عبادت کا مسئلہ ملت اسلامیہ کی سیاسی زندگی کے ساتھ اس طریق پر جذب و متحد ہے کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مذہبی اور معاشرتی امور کو الگ نہ رکھتے ہوئے مسجد کا تعمیر کرنا اس غرض پر مبنی ہے کہ مسلمان جس وقت چاہیں مسجد میں فوراً اکٹھے ہو کر حکومت و خلافت کے طرز عمل پر جرح و قدح کر سکیں۔ لیکن اگر انتخاب کنندہ جماعت کے سامنے تقریر نہ بھی کرنا چاہے تو اسے اختیار ہے کہ حکومت کے جس افسر کے طرز عمل کے خلاف وہ چاہے یا ایسے امر کے متعلق جس کا بحیثیت مجموعی تمام قوم پر اثر پڑ سکتا ہو، آئینی تحقیقات یا باصطلاح شریعت استفتار کرے۔ استفتار میں قاعدہ ہے کہ کسی خاص شخص کا نام لے کر ذکر نہیں کیا جاتا۔ مثال کے طور پر ہم وہ الفاظ نقل کرتے ہیں جو عموماً ہر استفتار میں استعمال کئے جاتے ہیں:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و فقہائے شرع مبین اس مسئلہ میں کہ ذمی لوگوں کی حوصلہ افزائی شرعاً جائز ہے یا نہیں اور کیا دیتے ہیں وہ رائے اس بارہ میں کہ ملکی انتظامات میں ذمیوں کو حکام و عمال کے منشی یا محرر بنانے یا لگان کے محصلین مقرر کرنے سے جو امداد و معاونت ان سے حاصل کی جاتی ہے، وہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ دلائل قاطع سے مسئلہ مذکورہ بالا کی توضیح فرمائی جائے

اور براہین ساطع سے اس کے متعلق حق کی تبئین کی جائے۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

اس قسم کے استفتاء حکومت خود بھی کرتی ہے۔ جب مفتیوں کے فتووں میں اختلاف رائے ہو تو عمل کثرت رائے کے فیصلہ پر کیا جاتا ہے۔ جبری انتخاب قطعاً ناجائز ہے لیکن مصری فقیہ ابن جمع کی رائے یہ ہے کہ سیاسی ہلچل کے زمانہ میں جائز ہو سکتا ہے۔ شریعت ایسے عمل کو جو فوری و ہنگامی ضرورت سے پیدا ہو تسلیم نہیں کرتی۔ اس قسم کے انتخاب جو اسلامی حکومتوں میں عمل میں آئے وہ بے شک و شبہ تاریخی واقعات کی نظیروں پر مبنی تھے نہ کہ آئین اسلام پر۔ اندلسی فقیہ طرطوسی بھی غالباً اسی خیال کا ہے۔ کیونکہ اس کا قول ہے کہ ظلم و ستم کے چالیس سال فتنہ و فساد کے ایک لمحہ سے اچھے ہیں۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اسلام میں منتخب شدہ و انتخاب کنندہ کے مابین کیا رشتہ و تعلق ہے۔ امام الماوردی نے اس تعلق کو لفظ "عقد" سے تعبیر کیا ہے۔ گویا حکومت ایک عقد و پیمان قائم کرنے والے نظام کا نام ہے جو حقوق و فرائض کا امین و محافظ ہے۔ الماوردی جب اس تعلق کو عقد سے تعبیر کرتا ہے تو روسو (Rousseau) کی طرح اس کا یہ منشا نہیں کہ سوسائٹی کے ماخذ کو ایک اولین معاشرتی عہد و پیمان پر مبنی کیا جائے۔ اس کا مطلب لفظِ عقد سے صرف یہ ہے کہ فی الحقیقت عملِ انتخاب خلیفہ اور جمہور مسلمانان میں ایک اس قسم کا پیمان ہے جس کی رو سے خلیفہ پر یہ واجب ہو جاتا ہے کہ وہ بعض خاص فرائض کو بجا لانے کا پورا پورا ذمہ دار ہو مثلاً وہ فرائض ان امور کے متعلق ہیں۔ حفاظت مذہب۔ شریعت پر عمل درآمد۔ شریعت کے مطابق محصول اور لگان کا عائد کرنا۔ سالانہ تنخواہیں تقسیم کرنا۔ بیت المال کے روپے کے مصرفوں کی نگرانی اور جانچ پڑتال کرنا۔ اگر خلیفہ ان کو بجا لائے تو مسلمانوں پر اس کے مقابلہ میں دو فرض عائد ہوں گے۔

اول خلیفہ کی اطاعت۔

دوم شریعت کے نفاذ میں اس کی مدد و اعانت۔

ثابت ہوا کہ الماوردی کے نزدیک حکومت کا ماخذ طاقت و جبروت نہیں بلکہ ان افراد کی آزادانہ باہمی رضا و مصالحت ہے جو اس فرض کیلئے متحد و متفق ہوئے ہیں کہ قانونی مساوات کی بنا پر ایک اس قسم کی اخوت قائم کریں جس کا ہر رکن شریعت اسلامیہ کے ماتحت بحیثیت فرد اپنی فطرت کے تمام ممکنات کا امتحان کر سکے اور اپنے انفرادی قویٰ کو کماحقہ ترقی دے کر اپنی انتہائی نشو و نما و ارتقاء کے کرشموں سے آگاہ ہو سکے۔ الماوردی کے خیال کے مطابق گورنمنٹ یا حکومت ایک مصنوعی خود ساختہ نظام ہے اور مقدس و مطہر صرف اس معنی میں ہے کہ شریعت اسلامیہ جیسا کہ مسلمانوں کا اعتقاد ہے، وحی پر مبنی ہونے کی وجہ سے بنی نوع کے امن و حفاظت کی کفیل و امین ہے۔

شیعی نظریۂ خلافت: اہل تشیع کے اعتقاد کے مطابق حکومت و سلطنت کا منبع "الوہیت" یعنی خود خدا ہے۔ خلیفہ یا ان کی

اصطلاح میں امام، ایک حق الہیہ کی رو سے حکومت کرتا ہے۔ یہ اعتقاد سب سے پہلے ایک غیر معروف عربی فرقے میں پیدا ہوا جسے سبائی کہتے تھے اور جس کا بانی عبداللہ بن سبا ایک یہودی یمن میں صنعا کا رہنے والا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس نے اسلام قبول کیا اور بالآخر مصر میں اقامت اختیار کر کے وہاں اپنے معتقدات کا وعظ لوگوں میں شروع کیا۔ اس کا یہ عقیدہ بالکل ان سیاسی عقائد کے مطابق و ہم معنی تھا جو قبل ظہور اسلام ایران میں مقبول و مسلّم تھے۔ لہٰذا اس عقیدے نے ایران میں بہت جلد جڑ پکڑ لی۔ ایرانیوں کے عقیدہ کے مطابق امام منتخب نہیں ہو سکتا بلکہ مامور من اللہ ہوتا ہے۔ (عمان کے شیعوں نے بیشک انتخابی اصول کو اختیار کیا اور یہ بھی تسلیم کیا کہ امام معزول بھی ہو گیا) وہ عقل کل کا اوتار ہوتا ہے، تمام کمالات کا جامع ہوتا ہے۔ فوق البشری ادراک و فراست اسے حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے فیصلے آخری اور ناطق اور بلا احتمال سہو و خطا ہوتے ہیں۔ پہلے امام حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے جن کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا۔ حضرت علیؓ کے بلا واسطہ اخلاف آپ کے خود مقرر کردہ جانشین ہیں۔ دنیا کبھی بغیر زندہ امام کے نہیں رہ سکتی خواہ وہ امام ظاہر ہو یا غائب۔ حضرات شیعہ کے اعتقاد کے مطابق ان کے بارہویں امام کوفہ کے نزدیک اچانک غائب ہو گئے۔ وہ پھر دوبارہ دنیا میں ظہور فرمائیں گے اور دنیا کو امن و امان اور خوشحالی و فارغ البالی سے معمور کر دیں گے۔ اس اثنا یعنی زمانہ غیبت میں وہ وقتاً فوقتاً اپنے مقبول و محبوب افراد کی وساطت سے (جنھیں باب کہتے ہیں) جن کا غائبانہ تعلق ہمیشہ ان سے قائم رہتا ہے، اپنی رضا و ارادہ کے متعلق لوگوں کو اطلاع دیتے رہتے ہیں۔ غیبتِ امام کا یہ مسئلہ سیاسی نقطۂ خیال سے نہایت اہم اور نتیجہ خیز ہے اور ہمارا خیال ہے کہ بہت کم علمائے اسلام و محققین شریعت نے اس کو کما ینبغی سمجھا ہے۔ یہ تو علم نہیں کہ بارہویں امام حقیقتاً غائب ہوئے یا نہیں۔ اتنی بات ضرور اظہر من الشمس ہے کہ غیبت امام کا عقیدہ اس قدر قابل داد حیلہ گری پر مبنی ہے کہ اس کے ذریعہ سے مذہب و حکومت میں بآسانی افتراق و اختلاف پیدا کیا جا سکتا ہے۔ امام غائب، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، تمام امور و معاملات میں آخری اور مطلق سند ہے۔ لہٰذا موجودہ ظاہری حکام و عمال اس املاک کے محافظ و نگران ہیں جس کا حقیقی وارث و مالک خود امام غائب ہے۔ امام غائب کو یہ وراثت بلا واسطہ پہنچتی ہے، سوائے اس صورت کے جہاں پہلے اماموں کے بلا واسطہ وارث نہ ہوں یعنی صرف اس صورت میں بالواسطہ آتی ہے۔ اس توضیح سے یہ بات بخوبی ذہن میں آجائے گی کہ شاہِ ایران کے کل اختیارات ایران کے ملاؤں کی ہدایت و تصرف کے زیر اثر ہیں۔ اس لئے کہ وہ امام غائب کے نمائندے ہیں۔ البتہ اس لحاظ سے کہ شاہِ ایران اس جاگیر کا سب سے اعلیٰ انتظامی حاکم ہے، وہ اس املاک و وراثت کی بہبودی کے لئے، جو ذرائع عمل میں لانا چاہے، لا سکتا ہے۔ تاہم چونکہ وہ اس املاک کا محض نگران و پاسبان ہے اسے ہمیشہ ملاؤں کی حکومت کے ماتحت رہنا پڑتا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے بعد اس بات میں کوئی حیرت و تعجب باقی نہیں رہے گا کہ ایران میں گزشتہ آئینی اصلاحات کے حصول کی جدوجہد کے زمانہ میں ملاؤں نے اس قدر مستعدی و جرأت سے کیوں کام لیا۔

خوارج (انتہائی جمہوریت پسند یا انارکسٹ) اور مسئلہ خلافت

خوارج کے معتقدات بیان کرنے میں بہت حد تک اجمال سے کام لیا جائے گا۔ کیونکہ ان کے سیاسی عقیدہ کے ارتقا کی تاریخ ابھی تک بہت تھوڑی لکھی یا سمجھی گئی ہے۔ خوارج کے نام سے، سب سے پہلے، اُس مشہور بارہ ہزار کے دستۂ فوج کو پکارا گیا جس نے جنگِ صفین میں حضرت علیؓ کے ماتحت لڑنے کے بعد آپ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ جس بات نے انھیں برافروختہ کیا وہ یہ تھی کہ حضرت علیؓ نے اپنے اور امیر معاویہؓ کے مابین خلافت کے تصفیہ کو ثالثوں پر چھوڑنے میں رضامندی کا اعلان کیا تھا۔ ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ فیصلہ قانون الٰہی یعنی قرآن کے مطابق ہونا چاہئے۔ انھوں نے حضرت علیؓ سے کہا کہ قوم ہمیں کتاب اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کی طرف بلاتی ہے اور اس کے مطابق فیصلہ چاہتی ہے۔ تم ہمیں تلوار اٹھانے کا حکم دیتے ہو اور جنگ پر آمادہ کرتے ہو۔ امام شہرستانیؒ کے نزدیک خوارج کے چوبیس فرقے ہیں۔ ان میں عام طور پر شریعت اور آئینِ اساسی کے مسائل کے متعلق ایک دوسرے سے تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔ مثلاً مختلف فیہ مسائل اس قسم کے ہیں۔ قانون سے لاعلمی معقول عذر ہے۔ زانی کو سنگسار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ قرآن میں اس سزا کا ذکر نہیں۔ تقیہ حرام ہے۔ خلیفہ کو امیر المومنین کے خطاب سے پکارنا ناجائز ہے۔ ایک ہی وقت میں دو یا دو سے زیادہ خلیفوں کا مسندِ خلافت پر متمکن ہونا شرعاً ناجائز نہیں۔

مشرقی افریقہ اور سزاب (جنوبی الجیریا) میں خوارج ابھی تک اپنے جمہوری منتہا کے سادہ عقیدے پر قائم و ثابت ہیں۔ عام عقائد کو مدنظر رکھتے ہوئے خوارج تین جماعتوں پر منقسم ہیں۔

(۱) وہ جن کا مذہب یہ ہے کہ خلیفہ منتخب ہونا چاہئے لیکن اس کی یہ شرط نہیں کہ وہ کسی خاص خاندان یا قبیلہ سے تعلق رکھتا ہو۔ عورت اور غلام بھی خلیفہ منتخب ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ پکے اسلامی حکمران ثابت ہوں۔ اس فرقہ کے خوارج جب کبھی برسرِ اقتدار آئے انھوں نے دانستہ اپنی قوم کے ادنیٰ طبقہ کے لوگوں سے خلیفہ منتخب کیا۔

(۲) دوسرے اس قسم کے خوارج ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ خلیفہ کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ جمہور مسلمان اپنے کوائف و حالات کے نگران آپ ہو سکتے ہیں اور اپنے آپ پر حکومت کر سکتے ہیں۔

(۳) تیسرے وہ جو مطلقاً کسی قسم کے نظام و حکومت کے قائل ہی نہیں۔ دوسرے الفاظ میں "اسلام کے انارکسٹ" کہئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ نے انہی لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا تھا "تم کسی نظام و حکومت میں ایمان نہیں رکھتے مگر نظام و حکومت کے بغیر چارہ نہیں خواہ اچھا ہو یا برا"۔

سیاسیاتِ اسلام میں یہی بڑے بڑے مذاہب ہیں جن کا ہم نے مختصراً ذکر کر دیا ہے۔ ان تمام کو مدنظر رکھتے ہوئے اس امر کے تسلیم کرنے میں شبہ نہیں رہے گا کہ قرآن پاک نے جو اصول اساسی قائم کیا ہے وہ انتخاب ہی کا اصول ہے۔ رہا یہ امر کہ عملاً حکومت کے

اس طرزِ عمل کو دنیا میں قائم کرنے کے لئے اس اصول کی کیا کیا تشریح و تاویل کی جا سکتی ہے اور اس سے کون کون سی فروعات و تفصیلات مستنبط ہوتی ہیں، اس بات کے فیصلہ کا دارومدار وقتی حالات و دیگر واقعات پر چھوڑ دیا گیا ہے جو مختلف زمانوں میں مختلف جگہوں میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ مگر شومئی قسمت سے مسلمانوں نے انتخاب کے مسئلہ کی طرف کما حقہ توجہ نہیں کی اور خالص جمہوری بناؤں پر اصولِ انتخاب کے مسئلہ کو فروغ دینے کی سعی سے قاصر رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان فاتحین ایشیا کے سیاسی نشو و ارتقاء کے لئے مطلقاً کچھ نہ کر سکے۔ بغداد اور اندلس میں بے شک بظاہر اصول انتخاب کی ہیئت کو قائم رکھا گیا لیکن اس قسم کے باقاعدہ سیاسی نظام کوئی قائم نہ کئے گئے جن سے بحیثیتِ مجموعی قوم کو استحکام و استقرار نصیب ہو۔ اسلامی ممالک میں سیاسی زندگی نے کیوں فروغ نہ پایا، میرے خیال میں اس کے دو بڑے وجوہ ہیں، اور وہ یہ ہیں:

(۱) اول تو ایرانیوں اور منگولوں کے افہام و اذہان ہی فطرتاً انتخاب کے مفہوم سے مستبعد اور نا آشنا تھے بلکہ اس کے مخالف اور اس سے متوحش تھے اور یہی دو سب سے بڑی قومیں ہیں جنہوں نے اسلام کو بطور مذہب قبول کیا۔ ڈوزی لکھتا ہے کہ ایرانی ہمیشہ خلیفہ کو مظہرِ الوہیت سمجھ کر اس کی پرستش پر آمادہ و کمربستہ رہے ہیں۔ جب کبھی ان کو یہ بتایا گیا کہ عبادت و پرستش خدائے واحد و برتر ہی کے شایانِ شان ہے اور ماسوا معبود نہیں ہو سکتا، تو انھوں نے ہمیشہ ایسے خلیفہ کے خلاف، جو معبود بننا مناسب سمجھتا ہو، بغاوت کی۔

(۲) دوسرا سبب میرے نزدیک یہ ہے کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی زندگی زیادہ تر فتوحات کی زندگی تھی۔ ان کی تمام قوت و ہمت تمام رجحان و میلان ملک و سلطنت کی تقویم و توسیع کے لئے وقف تھا۔ دنیا میں اس روش کا ہمیشہ یہی نتیجہ ہوا کہ حکومت اور ریاست کی باگ ہمیشہ چند افراد کے ہاتھ میں رہی ہے جن کا اقتدار، گو نادانستہ طور پر تاہم عملاً ایک مطلق العنان بادشاہ کے اقتدار کے مترادف ہو جاتا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس میں سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ جمہوریت قدرتاً شہنشاہیت کے دوش بدوش چلنے اور کام کرنے کو تیار نہیں۔

سید محب الحق صاحب مرحوم کی تصانیف

جنوری ۱۹۵۱ء کے طلوع اسلام میں مرحوم محب الحق صاحب کے مختصر سوانح حیات شائع کئے گئے تھے۔ اس ضمن میں ان کی تصانیف پر بھی مختصر تبصرہ کیا گیا تھا۔ طلوع اسلام کے متعدد قارئین نے ان تصانیف میں دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور فرمائش کی ہے کہ ہم ان کو وہ تصانیف مہیا کریں۔ ہمیں افسوس ہے کہ یہ تصانیف اب نایاب ہیں اور کسی قیمت پر بھی مہیا نہیں کی جا سکتیں۔

جاوید نامہ

علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہٗ

(نوشتہ ۱۹۳۲ء)

ان دنوں ڈاکٹر اقبال کی جدید تصنیف جاوید نامہ کے مطالعہ کا اتفاق مجھ کو ہوا۔ ان کی دیگر تصنیفات کی طرح یہ کتاب بھی دماغی لذت اور روحانی کیف کے لئے ایک لطیف نعمت ہے۔ بلکہ اس میں ایک جدت یہ ہے کہ شاعر نے پیر رومی کے ساتھ افلاک کی سیر کی ہے۔ مختلف سیاروں میں ارواح اور ملائکہ سے ملاقات ہوئی جن کے ساتھ حقائق اور عہدِ حاضر کے اہم مسائل پر سوالات اور جوابات ہوئے۔

پہلے فلک قمر پر رسائی ہوتی ہے جہاں ایک ہندوستانی سادھو ایک غار میں نظر آتا ہے اس کے ساتھ گفتگو ہوتی ہے اور وہ نو وصیتیں کرتا ہے۔ خاتمہ پر ایک فرشتہ نمودار ہوتا ہے جو ایک دلکش ترانہ گا کر غائب ہو جاتا ہے۔ پھر وادی طواسین میں پہنچتے ہیں۔ طاسین گوتم میں ایک زن رقاصہ مہاتما موصوف کے ہاتھ پر توبہ کرتی ہے۔ طاسین میں اہرمن زردشت کو آزماتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ طاسین مسیح میں حکیم ٹالسٹائی کا ایک حقیقت نما خواب ہے، اور طاسین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں حرم کعبہ میں ابوجہل کا نوحہ۔

فلک عطارد پر جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا (ترکی وزیر) کی روحوں سے ملاقات ہوتی ہے اور ان کے ساتھ وقت کے ضروری اسلامی مہمات پر گفتگو چھڑ جاتی ہے۔

فلک زہرہ پر اقوام قدیمہ کے دیوتاؤں کی محفل ملتی ہے جس میں ان کے نغمے سنائی دیتے ہیں۔ پھر دریائے زہرہ میں فرعون اور کچنر کی روحیں دکھائی دیتی ہیں وہاں سوڈانی درویش (مہدی) نکلتا ہے اور عربی روح کی بیداری کیلئے نغمہ سناتا ہے۔

فلک مریخ میں پہلے ایک رصدگاہ ملتی ہے جس سے مریخی حکیم برآمد ہوتا ہے جو زمین کی بھی سیر کر چکا ہے۔ پھر ایک فرنگن جو پیغمبری کی مدعی ہے عورتوں کے مجمع میں دکھائی دیتی ہے اور ان کو آزادی یعنی شوہروں سے بھی آزادی کا پیغام دیتی ہے۔

فلک مشتری میں ان روحوں سے ملاقات ہوتی ہے جنھوں نے سیرِ جاودانی اختیار کی اور جنت میں رہنا پسند نہیں کیا۔ مثلاً حلاج (منصور) غالب (اسداللہ خاں) اور قرۃ العین (بابی مبلغہ) ان کے ساتھ خوب خوب شاعرانہ گفتگو ہوتی ہے۔ آخر میں ابلیس نظر آتا ہے اور انسان کی کمزوری اور اپنی آسان فتوحات پر ماتم کرتے ہوئے کسی مردِ حق کی آرزو کرتا ہے جس کے مقابلہ میں شکست ہی کھا کر کچھ تو لذت پائے۔

فلک زحل پر وہ ارواح رذیلہ ملتی ہیں جن کو قبول کرنے سے دوزخ نے بھی انکار کر دیا ہے۔ ان میں ہندوستانی ملت کے

دو مشہور غدار جعفر بنگالی اور صادق دکنی خونیں قلزم کے عذاب میں پڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس کے بعد ماورائے فلک پر عروج ہوتا ہے اور جرمنی کے مشہور فیثے سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہاں سے جنت الفردوس کی طرف بڑھتے ہیں جس میں شرف النساء کا قصر نظر آتا ہے جو تیغ اور قرآن کی محافظ تھی۔ پھر سید علی ہمدانی اور ملا غنی کشمیری ملتے ہیں۔ اس کے بعد ہندو شاعر بھرتری ہری اپنا نغمہ سناتا ہے۔ وہاں سے سلاطین مشرق یعنی نادر شاہ ابدالی اور سلطان شہید دکنی کی زیارت کو جاتے ہیں، اور ان کے ساتھ مکالمے ہوتے ہیں۔ پھر قرب حضورؐ حاصل ہوتا ہے جہاں تجلیات میں غرق ہو جاتے ہیں اور دعا کرتے ہیں جس پر ندائے جمال آتی ہے اور یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

ان سب کے بعد کتاب کا اصلی مقصود اختصار کے ساتھ نژاد نو یعنی نئی نسل کو مخاطب کر کے سنا دیتے ہیں۔

یہ سب کچھ اس خوش اسلوبی اور لطف و کیف کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس کا مزہ صرف اس کے پڑھنے ہی سے مل سکتا ہے سارا کلام مربوط، متناسب، موجز مگر مکمل۔ چست اور حشو و زوائد سے پاک صاف اور برجستہ، پختہ اور بلند ہے۔ ایسے مضامین عالیہ کو جہاں اکثر الفاظ معانی سے قاصر ہو جاتے ہیں، اس خوبصورتی سے باندھنا اور ایسے سنگلاخ راستے کو اس سبک گامی کے ساتھ طے کرنا ڈاکٹر صاحب ہی کا کام تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اب ان کی آورد میں بالکل آمد کا لطف پیدا ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی تعلیمات اور ان کے مضامین سے عام طور پر تعلیم یافتہ طبقہ واقف ہے۔ وہی مضامین اور وہی تعلیمات نئے اسلوب اور نئے قالب میں اس کتاب میں بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ہر چند کہ ارواح قدیمہ اور جدیدہ کی زبانوں سے مختلف عوالم میں یہ باتیں کی گئی ہیں، لیکن سب کا اسلوب ایک اور انداز ایک ہے۔ کیونکہ وہ ایک ہی آفتاب کی شعاعیں ہیں یعنی قرآن کریم کی۔ ملاؤں کا قرآن نہیں، بلکہ آسمانی قرآن۔

ملاؤں کی حقیقت سعید حلیم پاشا کی روح سے سنئے:۔

دین حق از کافری رسوا ترست — زانکہ ملا مومن کافر گرست
زاں سوئے گردوں دلش بیگانۂ — نزد او ام الکتاب افسانہ
بے نصیب از حکمتِ دینِ نبی — آسمانش تیرہ از بے کوکبی
از شگرفیہائے آں قرآں فروش — دیدہ ام روح الامیں را در خروش
کم نگاہ و کور ذوق و بہرزہ گرد — ملت از قال و اقولش فرد فرد

دینِ کافر فکر و تدبیر جہاد
دینِ ملا فی سبیل اللہ فساد

سید جمال الدین افغانی کی روح ملتِ روسیہ کو پیغام دیتی ہے:-

منزل و مقصود قرآں دیگر است — رسم و آئینِ مسلماں دیگر است
خود طلسم قیصر و کسریٰ شکست — خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تا نہال سلطنت قوت گرفت — دینِ او نقش از ملوکیت گرفت
تو کہ طرح دیگرے انداختی — دل ز دستورِ کہن پرداختی
ہمچو ما اسلامیاں اندر جہاں — قیصریت را شکستی استخواں
تا برافروزی چراغے در ضمیر — عبرتے از سرگزشتِ ما بگیر
پائے خود محکم گزار اندر نبرد — گردِ ایں لات و ہُبل دیگر مگرد
کہنہ شد افرنگ را آئین و دیں — سوئے آں دیرِ کہن دیگر مبیں
کردۂ کارِ خداوندان تمام — بگزر از لاجانبِ اِلّا خرام
داستانِ کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کن از ام الکتاب

چیست قرآں خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

اشتراکیت کے قوام میں تین منفی چیزیں شامل ہیں یعنی نہ تاج، نہ سرمایہ، نہ مذہب۔

اگر انسان کے تاریخی ادوار، شکار، گلہ بانی، زراعت اور سلطنت پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہی آخری دور اس کیلئے سب سے سخت ابتلا کا دور ہے جو صد شکر کہ اب ختم ہو رہا ہے۔ تاج کے اردگرد امراء، وزراء، متعلقین اور افواج کی ایک جماعت ہو جاتی ہے جس کے تحت میں رعایا کے درجہ بدرجہ طبقات بنائے جاتے ہیں اور سارے ملک کی محنت تاج کی خدمت میں لگا دی جاتی ہے۔ اس طاغوتِ اعظم کے سایہ میں نہ صحیح خیالات فروغ پا سکتے ہیں، نہ سچے دین کی تربیت ہو سکتی ہے۔ اسلام نے قیصریت اور کسرویت کے طواغیت کبریٰ کو پاش پاش کر ڈالا تھا لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں مسلمان خود شخصی حکومت کے تخت پر آ گئے۔ اور جس بت کو توڑا تھا اُسی کو پھر نصب کر لیا جس کا نتیجہ بھی بھگتا۔

ملتِ روسیہ نے بھی اسلام کے دورِ اول کا کام کیا اور زیادہ سختی کے ساتھ کیا۔ کیونکہ تاج کے ساتھ تمام تعلقات نوابی، جاگیرداری، زمینداری اور ہر قسم کی سرمایہ داری کو بھی ختم کر دیا۔ یہی نفی کا ہے جو اسلام کا اولیں قدم اور اس کے کلمہ کا پہلا حرف ہے۔

قرآن وحدتِ نفسِ انسانی کا مبلغ ہے جو اخوت سے بھی بالاتر ہے اس لئے خاص انسانیت کے حقوق میں کسی قسم کا

امتیاز قرآن کی رو سے ممکن نہیں ہے۔ روسیوں نے بھی یہی امتیاز مٹایا ہے اور یہی نفی کا ہے۔

جملہ مذاہب (نہ کہ دین) اشخاص پرستی سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کی تاریخ، بنی آدم میں سوائے تفرقہ اندازی، سفکِ دم اور عداوت پیدا کرنے کے اور کچھ نہیں رہی ہے۔ ان کا مٹانا اسلام کا فریضہ ہے اور یہی روسیوں نے کیا۔ یہی نفی کا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب راستہ کو کہتے ہیں۔ اقوامِ عالم کے بڑے بڑے لوگوں نے جو طریقہ ایک خاص وقت یا ایک خاص ماحول میں اختیار کیا ان کے متبعین نے اسی کو اپنا دائمی مذہب بنا لیا۔ کارل مارکس کے مشہور مقولہ کے مطابق تمام مذاہب بڑے بڑے انسانوں کے خیالات ہی ہیں۔ لیکن دین وہ ہے جس کو خود خالقِ عالم نے انسانی فطرت کی اصلاح اور ترقی کے لئے روزِ ازل سے وضع فرمایا، اور انبیاء کرام کے ذریعہ سے اس کو دنیا میں پہنچاتا رہا۔ یہ ہمیشہ سے ایک ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہے گا اور یہی حق ہے یعنی ہر زماں اور ہر مکاں میں اٹل ہے۔ آج دنیا میں اس کا بے شائبہ مکمل اور واحد مجموعہ صرف قرآن ہے اور بس۔

اسی پیغام میں اس کی حقیقت سنئے۔

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست — نقشہائے کاہن و پا پا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمرست — ایں کتابے نیست چیزے دیگرست
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں — زندہ و پائندہ و گویاست ایں

دوسری جگہ اسی کتاب میں ہے:

چوں مسلماناں اگر داری جگر — در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیات اوست — عصرہا پیچیدہ در آنات اوست
یک جہانش عہدِ حاضر را بہست — گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا ست — ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست

چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش

قرآن ہر زمانے کے لئے ہدایت ہے اور ہر ماحول میں وہ نیا عالم پیدا کرتا ہے۔ مسلمانوں نے اصولی غلطی یہ کی کہ قرآن کی اُن شرحوں اور تاویلوں کو جو مخصوص اوقات اور حالات میں ہوتی رہیں، دائم و قائم سمجھ لیا۔ جس کے باعث قرآن متروک و مہجور ہو گیا۔ حالانکہ آج ان انسانی تفاسیر کا بڑا حصہ قطعاً بیکار بلکہ مردہ ہو چکا ہے اور قرآن اسی طرح زندہ اور سرچشمۂ ہدایت ہے۔ وہ ہر زمانہ میں ایک نئی تفسیر کا طلبگار ہے۔

ایک صاحب نے جو قرآن کا عمیق علم رکھتے ہیں اور کسی زمانہ میں روس کے اعلیٰ سیاسی طبقہ سے روشناس رہے ہیں مجھ سے مکہ معظمہ میں بیان کیا کہ انھوں نے مسٹر لینن اور ان کے رفقاء کار سے کہا کہ تم نے جو شکست و ریخت کی ہے وہ عین اسلام کے مطابق ہے۔ اس نے کہا مسلمان علماء تو ایسا نہیں کہتے۔ انھوں نے کہا کہ کسی کے کہنے یا نہ کہنے کی کیا بات ہے۔ روسی زبان میں قرآن کا ترجمہ موجود ہے۔ میں آیات خود تم کو دکھلا دیتا ہوں۔ جب اُس نے دیکھ لیا تو کہا کہ تعجب ہے کہ پھر مسلمان کیوں ہمارے خلاف ہیں۔ انھوں نے کہا کہ لادینی کی وجہ سے، جہاں تم نے باطل شکنی کی ہے، اگر حق کا بھی اقرار کر لو تو پھر تم سے بڑھ کر کوئی مسلمان نہیں۔ کیونکہ اسلام کا پیغام صرف یہ ہے کہ

"باہم بھائی بھائی بن جاؤ اور اکیلے اللہ کے بندے"

مگر ابھی وہاں نفی کا بحران ہے، اثبات تک پہنچنے میں نہ معلوم کتنا زمانہ لگے۔[1]

روس آج سے دو صدی قبل اسلام میں داخل ہو چکا ہوتا اگر علماء نے رکاوٹ نہ ڈالی ہوتی۔ صورت یہ ہوئی کہ پیٹر اعظم جو سلسلہ دار ترکوں سے لڑتا رہا اور جس کا مقابلہ عثمانی سلاطین مصطفیٰ ثانی اور احمد ثالث کے ساتھ رہا، اسلام سے بہت اثر پذیر ہوا۔ بارہویں صدی ہجری کے آغاز میں اس نے روس کے بڑے بڑے علماء کو جمع کر کے کہا کہ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں مگر دو چیزیں نہیں چھوڑ سکتا۔ خنزیر اور شراب۔ علماء نے حمیتِ اسلامی کے جوش میں ایسے اسلام کو تسلیم کرنے سے انکار کیا، اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ مسلم خواہ کتنا ہی گنہگار ہو غیر مسلم سے بہتر ہے، کیونکہ اس کی تلوار اسلام کی گردن پر نہیں چلے گی۔ ورنہ آج دنیا کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔

اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں سوویٹ روس میں اہل مذاہب اور مسلمانوں پر مظالم ہوتے ہیں۔ لیکن جو لوگ قرآنی زاویہ نگاہ رکھتے ہیں وہ دیکھ رہے ہیں کہ عالم میں جو کچھ حرب و ضرب، شورش و انقلاب، تغیر و تبدل ہو رہا ہے وہ سب تکمیل دین اور اتمام نور کیلئے ہو رہا ہے اور اسلام کے واسطے زمین تیار کی جا رہی ہے کیونکہ انسانیت کو ایک نہ ایک دن ان حقائق ثابتہ پر پہنچنا لازمی ہے۔

جو لوگ آئے دن قیامت کی پیشین گوئیاں کرتے، اس کے قرب سے ڈراتے اور عرصۂ حیات تنگ کرتے رہتے ہیں وہ بلا وجہ اپنے نفس اور امت کو دھوکے میں ڈالتے ہیں۔ ایسے قرائن اور شواہد موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم انسانی عہدِ طفولیت میں ہے اور جس کام کیلئے انسان کی تخلیق ہوئی ہے اس کا عشر عشیر بھی ابھی تک وہ نہیں کر چکا ہے۔ ابھی اس کو ہزارہا انقلابات دیکھنے ہیں تب جا کر کہیں "وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا" کا وقت آئے گا۔[2]

اشتراکیت اگرچہ ایک تاریخی چیز ہے، اور زمانہائے گزشتہ میں مختلف شکلوں میں بار بار اس نے سر نکالا ہے لیکن اس زمانہ میں نہایت شدت اور قوت کے ساتھ یہ تحریک دنیا میں پھیلی جاتی ہے، اسلئے مسلمانوں کو دینی لحاظ سے اس پر غور کرنا لازمی ہے۔

---

[1] یہ بحران اب رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

[2] یہ حقیقت ہے کہ زمانہ کا ہر قدم اسی منزلِ ربوبیتِ عامہ کی طرف اٹھ رہا ہے جسے قرآن نے نوعِ انسان کیلئے متعین کیا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

قرآن نظامِ عائلی کا محافظ ہے۔ صلہ رحمی اور قرابت کے حقوق کی ادائیگی کو اس نے انسان کے واجبات اور فرائض میں رکھا ہے اسلئے اشتراکیت کی انتہائی صورت جس میں یہ نظام بگڑتا ہو اسلام کے بالکل منافی ہے[۵۱]۔ بیشک جہاں تک قبضۂ زمین کا تعلق ہے وہ اشتراکیت کی موافقت کرتا ہے۔ سورۂ رحمٰن میں تصریح ہے کہ "وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ" (الایہ) زمین کو اللہ نے مخلوق کے لئے بنایا ہے) اس کا استعمال اسی صورت میں ہونا چاہئے جس میں مخلوق کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچ سکے۔ بادشاہوں یا زمینداروں کا زمین پر قبضہ نہ صرف اس کے فائدہ کو محدود کر دیتا ہے بلکہ مَا وُضِعَ لَهٗ کے خلاف ہے جو ظلم ہے۔

علمائے زمینداری کے جواز میں دو دلیلیں پیش کی ہیں ایک یہ کہ قرآن نے وراثت کا قانون رکھا ہے۔ دوسری یہ کہ زمینداری مسلمانوں میں ہمیشہ سے چلی آئی ہے۔ لیکن دونوں دلیلیں باطل ہیں۔

پہلی اس لئے کہ قانونِ وراثت یہ کب لازم کرتا ہے کہ ہر شخص زمین کی ملکیت چھوڑ کر مرے۔ دوسرے ترکے بھی ہو سکتے ہیں۔ اسلئے اس دلیل کی کوئی منطقی شکل ہی نہیں بن سکتی۔

دوسری دلیل کے دو جواب ہیں ایک الزامی، دوسرا تحقیقی۔ الزامی یہ ہے کہ مسلمانوں میں ملوکیت بھی مسلم چلی آئی ہے پھر اس کو کیوں چھوڑتے ہو، اور تحقیقی یہ ہے کہ مسلمانوں کو بھی دوسری قوموں کی طرح تاریخی ادوار سے گزرنا ناگزیر تھا۔ اس لئے ان کے قول و فعل سے کسی شے کے دینی ہونے کا ثبوت اس وقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ قرآنی سند اس کے ساتھ نہ ہو۔ جو قوم ملوکیت میں گرفتار ہو گئی وہ زمینداری میں کیوں نہ پھنستی۔ قرآن کی رو سے قابلِ زراعت آراضی پر انسانوں کو صرف حقِ انتفاع حاصل ہے نہ کہ حقِ ملکیت۔ البتہ مویشیوں پر قرآن شخصی ملکیت کا حق تسلیم کرتا ہے[۵۲]۔

سورۂ یٰسین میں ہے:

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ۔

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے ان کے لئے مویشی بنائے جس کے وہ مالک ہیں۔

یہیں سے اسلام اور اشتراکیت کا افتراق[۵۳] شروع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب اللہ کی بنائی ہوئی چیزیں اس کی ملکیت ہو سکتی ہیں تو اپنی مصنوعات اور کمائی تو یقیناً اس کی شخصی ملکیت ہوں گی۔

اسلام میں سب سے پہلے اشتراکی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہے جا سکتے ہیں جو اغنیاء کی دولت کو فقراء کا حق سمجھتے تھے لیکن

---

۵۱ اب تو خود روسی اشتراکیت کو اپنی اس شدت کا احساس ہو رہا ہے اور وہ پھر نظامِ عائلی کی طرف لوٹ رہا ہے۔ (طلوع اسلام)

۵۲ روس کے دستورِ جدید میں بھی اس حقِ ملکیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ دیکھئے۔ دنیا کس طرح قرآن کی طرف آ رہی ہے۔ (طلوع اسلام)

۵۳ اسلام اور اشتراکیت کے افتراق کی بنیاد درحقیقت مارکس کا وہ فلسفۂ زندگی ہے جس کی رو سے انسان کی زندگی ہی طبعی زندگی ہے اور بس۔ اور کائنات میں مستقل اقدار کا وجود نہیں۔ (طلوع اسلام)

غالباً اس میں منقولہ اور غیر منقولہ کا امتیاز نہ تھا اسی وجہ سے خلیفہ ثالث رضی اللہ عنہ نے ان کے اس خیال کو مفاد عامہ کے خلاف سمجھ کر ان کو ایک بیابانی مقام ربذہ میں بھیجدیا، وہیں انھوں نے ۳۲ھ میں وفات پائی۔

مسلمانوں کے بعض مہربان ناصح ان کو یہ نصیحت بھی کرتے رہتے ہیں کہ "اسلامی تمدن" کی حفاظت کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ تہذیب یا تمدن ملکی اور قومی چیزیں ہیں۔ قرآن جس طرح ہر ملک اور ہر قوم سے بالاتر ہے اسی طرح کسی تہذیب اور کسی تمدن کے ساتھ بھی اس کو کوئی خصوصیت نہیں۔ وہ قلوب اور اعمال کی اصلاح کیلئے آیا ہے اور ہر تہذیب اور ہر تمدن کو اسلامی بنا سکتا ہے۔

فلک مشتری پر ڈاکٹر صاحب کی ایک ادا قرآن کے خلاف معلوم ہوئی۔ اس لئے اس کو بھی ظاہر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ وہ جوہر مصطفےٰ کی حقیقت جس کو اللہ تعالیٰ نے معراج کے بیان میں "عبدہ" فرمایا ہے، حلاج کی زبان سے اس طرح بیان کرتے ہیں:

عبدہ از فہم تو بالا تر ست — زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر ست
عبدہ صورت گرِ تقدیر ہا — اندرو ویرانہا تعمیرہا
عبدہ دہر ست و دہر از عبدہ ست — ماہمہ رنگیم او بے رنگ و بوست
کس ز سرِّ عبدہ آگاہ نیست — عبدہ جز سرِّ الا اللہ نیست

یہانتک کہ صاف صاف کہتے ہیں:

لا الٰہ تیغ دودم او عبدہ — فاش تر خواہی بگو "ہو عبدہ"

یہ حقیقت میں غلو[1] ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانیت کے حدود میں رکھنے سے ان کا اسوۂ حسنہ انسانوں کیلئے دلکش اور آسان رہتا ہے۔ بخلاف اس کے دائرۂ الوہیت میں داخل کر دینے سے ان کی پیروی نہ صرف دشوار بلکہ غیر ضروری بھی ہو جاتی ہے۔ غالباً اسی نکتہ کی وجہ سے قرآن نے جہاں جہاں اس امر کو بیان کیا ہے حصر کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:۔

هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا (میں نہیں ہوں مگر ایک انسان پیغام لانے والا)

سورۂ کہف میں ہے:۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ (کہدے کہ میں تو بس تمہارے ہی جیسا انسان ہوں مگر مجھ پر وحی بھیجی جاتی ہے۔

یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بجز اس کے کہ عالم غیب سے اللہ ان کے اوپر وحی بھیجتا ہے، بشریت ہی کے دائرہ میں محصور ہے

---

[1] اس غلو کی مثالیں حضرت علامہ کے کلام میں کئی مقامات پر اور بھی ملتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ انھوں نے تصوف اور شخصیت پرستی کے خلاف اس قدر شدت سے جہاد کیا۔ بایں ہمہ بچپن کے ماحول اور تربیت کے اثرات ایسے تھے کہ جب کسی مقام پر جذبات کا وفور ہوتا وہ اثرات غیر شعوری طور پر ابھر آتے۔ ماحول سے غیر متاثر انسان کی کتاب ہی ہو سکتی ہے۔ (طلوع اسلام)

اور کوئی شعبۂ الوصیت کا اس میں نہیں ہے۔ مزید تصریحات قرآن کی متعدد آیات میں ہیں۔

خطاب بہ نژادِ نو، جوانوں کیلئے شمع راہ ہے۔ دو ہنگامی اور مقامی مدعیانِ نبوت کی بابت جو کچھ فرمایا ہے سننے کے قابل ہے۔

آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ — فتنۂ او حبِ مال و ترسِ مرگ
صحبتش با عصرِ حاضر در گرفت — دینِ حق را از دو پیغمبر گرفت
آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد — آں ز حج بیگانہ و ایں از جہاد
تا جہاد و حج نماند از واجبات — رفت جاں از پیکرِ صوم و صلوٰۃ
روح چوں رفت از صلوٰۃ و از صیام — فرد ناہموار ملت بے نظام
سینہا از گرمیٔ قرآں تہی — از چنیں مرداں چہ امیدِ بہی

ہم سُنا کرتے تھے کہ فارسی زبان سیکھنے کے بعد صرف چار کتابیں اچھی پڑھنے کو ملتی ہیں۔ شاہنامۂ فردوسی، مثنوی مولانا روم، گلستانِ سعدی اور دیوانِ حافظ۔ مگر اب جاوید نامہ کو بھی پانچویں کتاب سمجھنی چاہئیے جو کہ معنویت اور نافعیت کے لحاظ سے ان سب پر فوقیت رکھتی ہے حقیقت میں یہ اس قابل ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانانِ عالم کے نصاب میں شامل کر لی جائے۔

جی چاہتا تھا کہ اس کتاب کی تعلیمات کو میں آیاتِ الٰہی کی روشنی میں دکھلاتا مگر یہ ایک طویل شرح ہو جائیگی۔ اس لئے ایک مختصر سی نظم میں "زندہ رود" کو خطاب کر کے جو ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں اپنا لقب رکھا ہے، اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

زندہ رود

اے کہ ذاتِ تست ملت را چراغ — اے کہ شعرِ تست فردوسِ دماغ
اے کہ در سازت نوائے زندگی — خوش سرودی نغمہ ہائے زندگی
آتشے از سوزِ خود افروختی — جانِ ما افسردگاں را سوختی
طبع دراکت جہاں را واشگافت — شاعری در ذاتِ تو معراج یافت
در خیالِ خود گزشتی از فلک — تا شدی انباز با حور و ملک
وانسوئے گردوں جہانیدی سمند — در گزشتی از ہمہ پست و بلند
نورِ حق را در تلاطم دیدۂ — خویشتن را اندراں گم دیدۂ
عشق را تازہ برات آوردۂ — یعنی پیغامِ حیات آوردۂ
شرح دادی عالمِ موجود را — وانمودی منزلِ مقصود را
گفتۂ تو مغزِ جانِ شاعری — بر تو می نازد جہانِ شاعری
اے کہ از آبِ حیاتی زندہ رود — بر روانہائے تو از من درود[1]

---

[1] ہمارے خیال میں علامہ اقبالؒ کی خدمت میں اس نظم سے بہتر کوئی خراجِ تحسین نہیں پیش کیا جا سکتا۔ سچ ہے۔ شاہاں بہ شاہاں می دہند۔ (طلوعِ اسلام)

حضرت علامہ اقبالؒ سے آخری ملاقات

پرویز

(نوشتہ ۱۹۳۹ء)

۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء کی درمیانی شب گذشتہ سال کی ڈائری کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ گذری ہوئی کہانیاں ایک ایک کر کے سامنے آ رہی تھیں۔ جس طرح کوئی چھوٹا سا بادل کا ٹکڑا چاند کے سامنے سے گذرے تو وہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ چاند دوڑ رہا ہے یا بادل۔ اسی طرح دن گذرتے جاتے ہیں اور یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں یا زمانہ۔ ڈائری کے اوراق سے بعض بھولے ہوئے افسانوں کی یادیں تازہ ہوتی جا رہی تھی جس طرح عرقِ لیموں سے لکھے ہوئے حروف، کاغذ کو آگ کے سامنے رکھنے سے خود بخود ابھرتے چلے آتے ہیں۔ ابھی چند ورق الٹنے پایا تھا کہ ۱۰ جنوری کے صفحہ پر ایک ایسا واقعہ مندرج پایا جس نے نگاہوں کو وہیں روک لیا، اور ایسا محسوس ہوا کہ یہ کسی واقعہ کی یاد نہیں بلکہ ایک مضراب ہے جس نے بربطِ ہستی کے تاروں کو یوں چھیڑ دیا ہے کہ ان کے اندر سوئے ہوئے المیہ نغمات پھر سے بیدار ہو رہے ہیں۔ اور شعلہ ریز دیپک کے سُروں میں تمام کائنات پر چھائے جا رہے ہیں۔ واقعہ کی تمہید یوں ہے کہ ۹ جنوری کو "دہلی کا قافلہ" زیرِ امارت مولانا محمد اسلم صاحب جیراج پوری بتقریب "اقبال ڈے" لاہور پہنچا۔ رات تک مصروفیت رہی۔ ان اجلاس کا تذکرہ بھی ڈائری میں لکھا پایا۔ لیکن ۱۰ جنوری کی صبح کے واقعہ کی تفصیل جو ڈائری کے کئی ایک صفحات پر پھیلی ہے کچھ ایسی وجد انگیز ہے کہ جی چاہتا ہے کہ بزمِ طلوعِ اسلام کو بھی اس حظ و کیف میں شریک کروں۔ بہتر ہو کہ اسے ڈائری کے الفاظ ہی میں سنئے۔

۱۰ جنوری بروز سوموار صبح ۹ بجے جاوید منزل واقعہ میور روڈ پر حاضر ہوئے۔ نذیر نیازی صاحب حسب وعدہ وہاں پہلے ہی موجود تھے۔ حضرت علامہ پلنگ پر استراحت فرما رہے تھے۔ لحاف اوڑھے ہوئے بلکہ لحاف کے ساتھ ایک کمبل بھی ملفوف تھا۔ حقہ سامنے تھا جو ہمیشہ سامنے رہتا ہے۔ نیازی صاحب نے بتایا کہ جب پچھلے دنوں لارڈ لوتھین ملنے کیلئے آیا، تو بھی آپ اسی انداز میں لیٹے لیٹے ملے تھے۔ آواز ابھی تک صاف نہیں ہوئی۔ اس طرح بولتے ہیں جیسے کسی کی گھگھی بندھ رہی ہو۔ مولانا صاحب کی وجہ سے سلسلۂ گفتگو اردو میں چھڑا۔ لیکن آپ کے لب و لہجہ سے حسب معمول "پنجابیت" صاف نمایاں تھی جسے وہ کسی تکلف کے پردہ میں چھپانا نہیں چاہتے۔ عمر قریب ساٹھ برس سمجھئے۔ لیکن اس دفعہ کمزور ہو رہے تھے۔ بایں ہمہ اس کمزوری اور بڑھاپے میں بھی دبدبہ اور عظمت کی وہی شان تھی۔ لیکن سادگی اتنی کہ اگر کسی کا پہلے تعارف نہ ہو تو وہ شاید ہی سمجھے کہ

کسی لکھے پڑھے آدمی کے سامنے بیٹھا ہے۔ پہلے متفرق سلسلۂ کلام شروع ہوا۔ آپ کی باتوں میں ہلکی سی ظرافت کی چاشنی جسے ظرافت کی بجائے شگفتگی کہنا زیادہ موزوں ہوگا ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ لیکن آج کل آپ کی علالت کی وجہ سے یہ ضرورت بھی رہتی ہے کہ سنجیدہ گفتگو کو یہاں وہاں سبک رو کر دیا جائے۔ ضمناً ایک بات سامنے آگئی فرمایا کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے جب واپس آرہے تھے تو مولوی شفیع داؤدی صاحب (مرحوم) بھی ساتھ تھے۔ میں عرشہ جہاز پر کانفرنس کی روئداد دیکھ رہا تھا کہ کتاب ہاتھ سے گر گئی۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں عرب لڑکے جہاز کے ساتھ ساتھ آرہے تھے، مولوی صاحب کو عربی آتی نہیں تھی، گھبراہٹ میں آواز دی کہ یا شیخ! ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهَا۔ وہ سمجھ گئے اور کتاب جو اتفاق سے ایک کشتی میں جا گری تھی اٹھا لائے۔

جاوید نامہ کے متعلق کچھ ذکر آیا تو میں نے عرض کیا کہ دربارِ فرعون کے ساحر، جن کی قوتِ ایمانی استبدادِ فرعون کا دندان شکن جواب ہے، انھیں جاوید نامہ میں ضرور جگہ ملنی چاہیئے تھی۔ فرمایا کہ جاوید نامہ میں تو بہت سی چیزیں لکھنے سے رہ گئیں۔ جی چاہتا تھا کہ کہیں سید احمدؒ (بریلوی) اور سید احمد دہلوی (سرسید) کی روحوں کو بھی اکٹھا کر دوں۔ یہ بھی نظر انداز ہو گیا اور بھی بہت سی باتیں میں نے نوٹ کر کے رکھی تھیں۔ اب کسی اور موقعہ پر ان کو لکھوں گا۔

میں نے عرض کیا کہ قرآن کریم میں اس منزل کے بعد دوسری منزل کے لئے جہاں ایک طرف انسانوں کے متعلق یہ آیا ہے کہ وَالٰی رَبِّھِمْ یَنْسِلُوْنَ (وہ اپنے رب کی طرف دوڑتے ہوئے جائیں گے) دوسری طرف خدا کے متعلق بھی ہے کہ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (کہ تیرا رب اور فرشتے صف در صف آئیں گے) گویا خدا خود اس زمین پر آئیگا اور وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّھَا (زمین اس کے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی) تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی یہ ڈراما کچھ اور سین اسی سٹیج پر دکھائے گا۔ فرمایا کہ یہ درست ہے لیکن ارض و سما اور پستی و بلندی کا تصور تو موجودہ شعور کے تابع ہے۔ جب شعور بدل جاتا ہے تو زمان و مکان (Time and Space) کے تصورات بھی بدل جاتے ہیں۔ اگلی منزل میں شعور بدل جائے گا۔ کیا معلوم ارض کیا ہو اور سما کیا ہو یا دونوں ایک ہی ہوں۔ اسی لئے تو فرمایا کہ یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (جس دن یہ ارض و سموات بدل جائیں گے) شعور کی ارتقائی منازل کا تقاضا ہے کہ زمان و مکان کے بُعد باقی نہ رہیں۔ خواب میں دونوں چیزیں باقی نہیں رہتیں، نہ وقت کوئی شے رہتا ہے نہ مکان۔ ایک سکنڈ کے خواب میں ایک شخص بارہ برس تک امریکہ بھی رہ آتا ہے۔ یہ محض ایک مثال ہے ورنہ کیا معلوم کہ دوسرے شعور میں کیفیت و کمیت کا کیا عالم ہو۔

فرمایا کہ جب میں کیمبرج میں پڑھتا تھا تو Time کے نظریہ پر ایک مقالہ لکھ کر اپنے استاد Mctaggart کے

پاس لے گیا، اس نے کہا کہ یہ کیا لکھ دیا؟ اس پر لوگ ہنسیں گے۔ میں نے اسے ضائع کر دیا۔ ایک عرصہ کے بعد جب برگساں کے نظریئے شائع ہوئے تو ان میں ٹائم کے متعلق وہی کچھ تھا جو میں نے لکھا تھا۔ اس وقت مجھے اپنے مقالہ کے ضائع کر دینے کا بڑا افسوس ہوا اس لئے کہ میرے مقالہ سے قرآن کریم کی حقیقتِ ثابتہ سامنے آجاتی تھی۔

اس کے بعد برگساں نیٹشے اور اپنے فلسفہ کے اختلافات کی توضیح فرماتے رہے اور بتایا کہ وہ فلسفہ جس کا سرچشمہ علمِ الٰہی ہو کس طرح ایک یقینی شے بن جاتی ہے اور وہ فلسفہ جو محض انسانی دماغ کا رہینِ منت ہو کس طرح ظن و قیاس کی وادیوں میں سرگرداں رہتا ہے، اور جب کبھی اسے یقین کا رتبہ حاصل ہوتا ہے، تو ہو نہیں سکتا کہ وہ قرآن کے خلاف ہو۔ آپ یہ کچھ بیان فرما رہے تھے اور ہمیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ہم کسی نئی دنیا میں ہیں۔ اس وقت معلوم ہوا کہ ذہنِ انسانی کی وسعتیں کس قدر حدود ناآشنا ہیں۔ اور یہ ہستی جسے دنیا نے محض ایک شاعر کی حیثیت سے پہچانا ہے علم و ادراک کی کن بلندیوں پر ہے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سر سے پاؤں تک دماغ ہی دماغ ہے اور دماغ بھی ایسا جو ثریا سے ورے کی بات ہی نہ جانتا ہو۔ بڑے بڑے اہم حقائق اور ادق مسائل کو دو دو جملوں میں صاف کرتے جاتے تھے۔

پھر قرآن کریم کے متعلق ذکر آگیا، فرمایا کہ جب میں ایف، اے میں پڑھتا تھا تو صبح کی نماز کے بعد قرآن کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ والد مسجد سے نماز پڑھ کر آتے تو کبھی منزل ختم کر چکا ہوتا کبھی جاری ہوتی۔ ایک دن آکر پوچھتے ہیں کہ کیا پڑھتے تھے؟ مجھے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آگیا کہ چھ مہینے ہو گئے، ہر روز دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم پڑھتا ہے پھر یہ سوال کیسا ہے؟ نہایت نرمی سے فرمایا کہ میں پوچھتا ہوں کہ کچھ سمجھ میں بھی آتا ہے؟ اب میرا استعجاب اور غصہ جاتا رہا اور کہا کہ کچھ عربی جانتا ہوں، کہیں کہیں سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ بات ختم ہو گئی۔ کوئی چھ ماہ بعد ایک دن لے کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ بیٹا قرآن کریم اسی کی سمجھ میں آسکتا ہے جس پر یہ نازل ہوتا ہے۔ میں حیران تھا کہ کیا نبی اکرمؐ کے بعد قرآن کریم کسی کی سمجھ میں آہی نہیں سکتا؟ فرمایا کہ یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ قرآن کریم حضورؐ کے بعد اب کسی پر نازل ہی نہیں ہو سکتا۔ پھر میں حیران تھا؟ فرمایا کہ انسانیت کو جس معراج پر پہنچانا فطرت کا مقصود ہے، اس کا نمونہ ہمارے سامنے محمدؐ کی صورت میں پیش کر دیا گیا ہے۔ حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت عیسیٰؑ تک ہر ایک نبی محمدؐ ہی کے مختلف مدارج تھے وہ سلسلہ گویا (Mohammad in the making) تکمیلِ محمدؐ کے منازل تھے۔ بنیادی اصول ہر جگہ ایک تھا۔ البتہ شعورِ انسانی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ فروعات کی تکمیل ہوتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ "محمدؐ" مکمل ہو گیا۔ بابِ نبوت بند ہو گیا۔ انسانیت اپنے معراجِ کبریٰ تک پہنچ گئی۔ اب ہر انسان کے سامنے معراجِ انسانیت کا نمونہ محمدؐ ہے، کوئی انسان جتنا محمدیتؐ کے رنگ میں رنگا جاتا ہے اتنا ہی قرآن کریم اس پر نازل ہوتا جاتا ہے۔ یہ مفہوم تھا میرے کہنے کا کہ قرآن کریم اسی کی سمجھ میں آسکتا ہے جس پر یہ نازل ہونا شروع ہوتا ہے۔

یہ تو تھی قرآن کریم کے قلب کے راستے سمجھ میں آنے کی صورت۔ دماغ کی راہ سے سمجھ میں آنے کے متعلق حضرت علامہ نے فرمایا کہ قرآن فطرت اللہ ہے۔ یعنی دنیا میں مختلف اوقات میں مختلف حقائق ظاہر ہوئے، کوئی یہاں کوئی وہاں، ہر حقیقت فطرت اللہ ہوتی ہے۔ ان حقائق کے منتشر اوراق ایک جگہ جمع کر دیئے اس مجموعہ کا نام قرآن کریم۔ اب بھی جہاں کہیں کوئی حقیقت ظاہر ہوگی وہ لینن کے الفاظ میں ہو، یا سنوسی کے، قرآن ہی کی کسی آیت کا ترجمہ ہوگا۔ اس لئے کہ حیاتِ انسانی کیلئے جس قدر حقائق کی ضرورت تھی وہ سب کے سب اس کے اندر آچکے ہیں۔ اب قرآن کریم کو اس طرح سمجھنا چاہئے جس طرح یہ دنیا کو ملتا چلا آیا ہے۔ کبھی ایک حقیقت کسی زرتشت کو ملی تھی، کہیں کسی بدھ کو۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے پہلے ان تمام مذاہب کو دیکھئے۔ وہاں نظر آجائے گا کہ حقائق کون کون سے ہیں۔ اور افسانے کون کون سے۔ حالانکہ اس مذہب والے ان افسانوں کو بھی حقائق ہی سمجھتے ہوں گے۔ ان کے حقائق قرآن کریم میں موجود ہوں گے اور ان کے افسانوں کی تردید ہوگی۔ یہ افسانے انسانی دماغ کے وضع کردہ ہوں گے۔ جب تک ان افسانوں سے واقفیت نہ ہو معلوم نہیں ہو سکتا کہ قرآن کریم کس چیز کی تردید کر رہا ہے مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ ہم نے ارض سماء کو لاعبین in sport کھیل کود میں پیدا نہیں کیا۔ ہندوؤں کے ہاں ایک عقیدہ ہے کہ یہ تمام کائنات ایشور نے ایک "لیلا" رچائی ہے۔ چنانچہ ان کے ایک خدا کا نام "نٹراجن" کھلاڑیوں کا بادشاہ ہے۔ اس کی مورتی بھی ایسی ہے کہ وہ رنگ راگ میں مصروف ہے۔ اور دنیا پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس افسانے کی تردید لاعبین کے اندر ہے۔ یا مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ لا تأخذہ سنۃ ولا نوم (خدا کو اونگھ یا نیند نہیں آتی) ہندوؤں کے ہاں ایک عقیدہ ہے کہ یہ سب کائنات پرماتما کا خواب ہے جب وہ بیدار ہو جائے گا تو یہ خواب بھی پریشان ہو جائیگا۔ خود ہمارے ہاں بھی بعض صوفیاء میں اس قسم کا تصور موجود ہے۔ اس افسانہ کی تردید قرآن کریم نے ان الفاظ میں کی ہے لہٰذا قرآن کریم سمجھنے کیلئے پہلے اس قسم کے "افسانوں" کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے۔ خالص حقائق اب قرآن کریم کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتے۔

رسول کی تعریف (Definition) کے متعلق فرمایا کہ ایک رسول میں اللہ کی طرف سے یہ شعور پیدا کر دیا جاتا ہے کہ وہ امتدادِ زمانہ (Length of time) کو سمیٹ کر ایک حال (Present) کے اندر مرتکز کر لے۔ لہٰذا جو باتیں دوسروں کے نزدیک دو ہزار برس بعد آنے والی ہوتی ہیں وہ رسول کے سامنے زمانۂ مستقبل کی نہیں بلکہ حال کی ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ اپنی وحی میں اس قدر محکم یقین رکھتا ہے کہ اس کی سچائیاں اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں، وہ ان کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ اس لئے اس کے دل میں شک و ریب کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔

سیاستِ حاضرہ کے متعلق بہت سی باتیں ہوتی رہیں۔ فرمایا مجھے تو نظر آتا ہے کہ انہی عوام میں سے کوئی صاحبِ ایمان

کھڑا ہو جائے گا اور مسلمانوں کو ایک مرکز پر لے آئے گا۔ اس کی عملی شکل ان کے سامنے وہی ایک اسلامی ریاست (پاکستان) کا تصور ہے۔ فرمایا کہ اس کے سوا ہندوستان کی سیاست کا کوئی اور عملی حل سمجھ میں نہیں آتا۔

یہ سب کچھ اقبال کے دماغ کے متعلق تھا، لیکن حقیقی اقبال ان پردوں کے پیچھے قلب کی انتہائی گہرائیوں کے اندر چھپا رہتا ہے۔ ہر چند نیازی صاحب نے کہہ رکھا تھا کہ کسی جذباتی چیز کا تذکرہ نہ چھیڑنا کیونکہ اس کا ان کی صحت پر بے حد مضر اثر پڑتا ہے۔ لیکن ایک بات غیر ارادی طور پر ایسی آگئی جس سے ہمیں حقیقی اقبال کی ایک جھلک دیکھنی بھی نصیب ہو گئی۔ مولانا صاحب نے دریافت کیا کہ آج کل کوئی تازہ کلام کہا گیا ہے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ یہ زخمہ کس تار پر جا لگے گا۔ فرمایا کہ گذشتہ چھ ماہ سے جب سے حج کا ارادہ ہوا ہے صبح سے شام تک مدینہ ہی کے راستے میں رہتا ہوں۔ جو کچھ کہتا ہوں وہ بھی کچھ وہیں کی ہی باتیں ہوتی ہیں۔ یہ کہا اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ کچھ طبیعت سنبھلی تو فرمایا، بہت کچھ دل میں ہے کہ حضورؐ کے آستانۂ اقدس پر پہنچوں گا تو یہ بھی عرض کروں گا وہ بھی، راستہ طے کر لیتا ہوں لیکن جب وہاں پہنچتا ہوں تو طبیعت قابو میں نہیں رہتی۔ نیازی صاحب سے فرمایا کہ تازہ کلام سے کوئی شعر ان کو سناؤ۔ انھوں نے ایک شعر سنایا تو فرمایا کہ ہاں ایک شعر یاد آ گیا، کعبۃ اللہ میں پہنچ کر یہ حضورِ حق عرض کیا ہے کہ:-

تو باش این جا و با خاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

پہلا مصرعہ تو آسانی سے پڑھ دیا، لیکن دوسرے مصرعہ میں "منزلِ دوست" تک پہنچے تو ایک عجیب کیفیت سامنے آئی۔ دیکھا کہ تمام جسم پر ایک ارتعاشی حالت پیدا ہو گئی ہے۔ لیٹے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ یوں محسوس ہوا کہ سارا کلیجہ اُمنڈ کر منہ میں بھر آیا ہے، گلا پھول گیا۔ چہرہ سرخ ہو گیا، اسے بڑی مشکل سے یوں دبایا جیسے کسی چیز کو حلق سے نیچے لے جا رہے ہیں، بڑے کرب و اذیت کے بعد انتہائی اضطراب کے عالم میں بچوں کی طرح ہچکیاں لے کر رونے لگے، غش کی سی حالت ہو گئی اور نڈھال ہو کر لیٹ گئے۔

ہم ششدر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ یا اللہ یہ کیا ہو گیا، ایک ہیبت سی طاری ہو گئی، سارے کمرے میں سناٹا تھا۔ ہمیں رہ رہ کر افسوس آتا تھا کہ ہم نے کیوں اس مضمون کو چھیڑ دیا۔

کچھ دیر اور بیٹھے کہ ان کی طبیعت سنبھل جائے۔ اجازت چاہی تو مولانا صاحب سے فرمایا کہ ایک دن اور ٹھہرنے کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی! ہماری دفتر کی پابندیاں اس کی کب اجازت دیتی تھیں اطوعاً و کرہاً رخصت ہوئے، دیکھا تو بارہ بج چکے تھے۔ تین گھنٹے گزر گئے اور یوں معلوم ہوا کہ شاید پانچ منٹ ہوئے ہیں۔

زندگی میں چند لمحات بعض اوقات حاصلِ زندگی بن جاتے ہیں۔ یہ چند لمحات اسی قسم کے تھے۔ اب کچھ سمجھ میں آیا کہ اقبال کہاں پہنچ چکا ہے۔ دماغ ہے تو عرش کی بلندیوں پر، اور قلب ہے تو عشقِ رسولؐ میں خاکستر! اے کاش مسلمانوں کی سمجھ میں آجاتا کہ انھیں فطرت کی کرم گستری نے کس قدر بیش بہا نعمت عطا فرمائی ہے!

(مرقومہ ۱۲ر جنوری ۱۹۳۸ء)

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس ملاقات میں جتنی باتیں ہوئیں اور جس طرح ہوئیں میں نے وہ سب اس یادداشت میں لکھ لی تھیں۔ بہرحال یہ تھے وہ تاثرات جو میرے ذہن میں باقی تھے جنھیں میں نے محفوظ کر لیا۔ اس وقت اس کی بھی کیا خبر تھی کہ یہ ملاقات آخری ہوگی اور اس کے بعد عالم اسلامی کی یہ جلیل المرتبت ہستی ہمیشہ کے لئے آنکھوں سے پنہاں ہو جائے گی۔ اس کمی کو کچھ وہی محسوس کر سکتے ہیں جنھیں کبھی حضرت علامہؒ کی خدمت میں باریابی کی سعادت حاصل ہوئی ہو۔ آج تو اس قسم کی یادداشتوں کے اوراق ہیں اور دلِ حرماں نصیب کی حسرتیں کہ

دگر دانائے راز آید کہ ناید

ہندوستان میں
طلوع اسلام کی سول ایجنسی
ہاشمی نیوز ایجنسی
نیل صاحب روڈ
ناگپور ۲
کے پاس ہے۔ ہندوستان کے ایجنٹ اور خریدار
اپنی فرمائشیں انہی کے پاس بھیجیں۔

لاہور میں طلوع اسلام کی سول ایجنسی
مکتبہ جدید، چوک انارکلی کے پاس ہے۔

دینِ اقبال

محترم عرشی صاحب

پیغمبر اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کو جب رسالت پر مامور کیا گیا تو انھوں نے شرح صدر، سہولتِ کار، روانی زبان اور ہارونؑ کا تعاون حاصل کرنے کے لئے دعا مانگی، ان کی دعا قبول ہوئی ——— پیغمبر سخن علامہ اقبالؒ کے دل میں جب یہ پیغام القا کیا گیا کہ امت مسلمہ کی آسودہ خواب خودی کو بیدار کریں تو ان کے لب پر بھی ایک دعا آئی:

یارب درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ　　　در بادہ نشہ را نگرم، آں نظر بدہ

حالات نے قطعی شہادت دی کہ ان کی یہ دعا قبول ہوئی، ان کو دلِ باخبر اور نگاہ پیش بیں عنایت فرمائی گئی۔ یوں تو ان کی دعائیں اتنی ہیں کہ ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک اچھا خاصہ ذخیرۂ ادعیہ بن جائے، لیکن اس وقت ہمارے مضمون سے یہی دعا تعلق رکھتی ہے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ اس زمانے کے مدعیانِ نبوت کی پیشگوئیوں کو بار بار شکست و ذلت کا سامنا ہوا، لیکن اقبالؒ نے کسی دعوے کے بغیر عالمگیر پیشگوئیاں کیں اور وہ پوری ہوئیں، انہی کی پیش گوئی اور پیش بینی کا زندہ ثبوت سلطنتِ خداداد پاکستان ہمارے سامنے موجود ہے۔ انھوں نے پاکستان کا خواب اسوقت دیکھا جب اپنوں پرایوں میں سے کوئی ایک شخص بھی اس کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تھا ——— یہ اسی

در بادہ نشہ را نگرم، آں نظر بدہ

کی کرامت تھی ——— پاکستان وجود میں آچکا ہے لیکن ابھی اس میں انگریز کی روح حرکت کر رہی ہے۔ آخر یہ مستعار روح کب تک؟ کیا اس قوم کے پاس کوئی اپنی روح نہیں؟ ——— یہ ہے اسوقت پاکستان، بلکہ تمام دنیائے اسلام کا تنہا سوال، جس کے حل کے لئے ۸ کروڑ مسلمان بے تاب ہیں اور "ہر کسے از ظن خود شد یارِ من" کا سماں پیش نظر ہے۔ اس تگ و دو کو چار سال ہونے کو آئے، لیکن اسلام کی زبانِ حال "وز درونِ من نجست اسرارِ من" کی فریاد کر رہی ہے ——— اقبال، جس کی بصیرت نے قریب تمام اسلامی طبقوں سے خراج اعتماد حاصل کیا، کیا اس موقع پر اس کے خزانے میں ملت کی راہنمائی کے لئے کوئی زادِ راہ ہے؟ اس وقت جب کہ کچھ با اقتدار لوگ جنھیں انگریزی تہذیب کی یادگار رکھنا چاہیئے، فرنگی دستور و آئین کی ناکامی و شکست خوردگی کے باوجود اسی کو اپنا ملجا و ماوی سمجھے ہوئے ہیں، اور کچھ مقدس قسم کے بزرگ ہیں جو اپنے علمی عجائب خانوں سے پرانی گٹھڑیاں نکال کر

لا رہے ہیں کہ نئے زمانے کے دکھوں کی دوا ان کی متضاد و متخالف قرابادینوں میں ملے گی۔ اقبال نے ان دونوں جماعتوں پر خطِ نسخ کھینچا اور کہا:

نے ابلہ مسجد ہوں نے تہذیب کا فرزند

بظاہر پاکستان کے قیام و بقا کے لئے انہی دو ذریعوں (قدیم یا جدید) میں سے کوئی ایک ہو سکتا تھا لیکن اقبال دونوں سے مایوس ہے۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک

اور اپنی اسی ملہمانہ بصیرت سے، جس نے خودی کا نغمۂ نو ایجاد کیا ایک تیسرا ذریعہ ڈھونڈ نکالا جو نہ محض قدیم ہے اور نہ صرف جدید، بلکہ وہ قدامت و جدت، دونوں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ قدامت وہ جو تاریخ کی عمر سے زیادہ پرانی اور مستحکم ہے اور جدت وہ جو ہمارے تصور میں سما نہیں سکتی۔

جب ہم علامہ مرحوم کے نظم و نثر کے ذخیروں کو کھنگالتے ہیں تو ہمیں مختلف اسالیب سے بار بار ایک ہی آواز سنائی دیتی ہے۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اس سے ہماری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ ان کا معیارِ استناد اور دولتِ استشہاد قرآن اور صرف قرآن ہے، وہ ہماری تفسیری کہانیوں سے بالکل الگ ہو کر قرآن کو دیکھتے ہیں ـــــ آخر یہ کہانیاں کیا ہیں، جنہوں نے وحدتِ امت کو پارہ پارہ کر رکھا ہے۔ بیشک ان میں سے کئی ایک اپنے وقتوں میں کام کی چیز رہی ہوں گی، اور دیدہ ور آدمی اب بھی تلاش کر کے ان کے پست سے بلند کو الگ کر سکتا ہے۔ لیکن یہاں کی دانشمندی تھی کہ ان کی بنا پر مذاہب کھڑے کر دیئے جائیں اور متن کتاب کے نور سے آنکھوں کو محروم کر دیا جائے۔ اور کتاب بھی وہ جس میں تمام اقوامِ عالم کے لئے حیاتِ طیبہ کا سامان موجود ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

چوں سرمۂ رازی را از دیدہ فرو شستم تقدیر امم دیدم پنہاں بکتاب اندر

مصطفیٰ کمال کی اسلام سے مایوسی اور فرنگ کی چاپلوسی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

چوں مسلماناں اگر داری جگر در ضمیر خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا ست ہر جہاں اندر برِ او چوں قبا ست
چوں کہن گردد جہانے در برش می دہد قرآں جہانے دیگرش

قرآن اپنی آیتوں سے بے شمار سلطنتوں اور حکومتوں کو جنم دے سکتا ہے، ان کے قیام و نظام کے اسباب فراہم کر سکتا ہے۔

اس کے اندر ہر نئی سلطنت کے لئے نیا آئین موجود ہے۔ لیکن اس کے لئے ضرورت ہے سینے میں دلِ معنی رس کی اور تمام خارجی اثرات سے آزاد ہو کر صرف ضمیر انسانی اور قرآن میں پیوستگی کی

در ضمیر خویش و در قرآں نگر

اگر ضمیر پر غیر قرآنی رنگ چڑھ گیا تو قرآنی نور دکھائی نہیں دے سکے گا۔

یہ انسانی دنیا جس کا طول و عرض اس وقت ابلیس کے تسلط میں ہے، علامہ کے نزدیک اس کا علاج قرآن اور صرف قرآن ہے۔ چنانچہ جاوید نامہ میں سید جمال الدین افغانیؒ کی زبان سے فرماتے ہیں:

کشتن ابلیس کارے مشکل است زانکہ او گم اندر اعماق دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی کشتۂ شمشیر قرآنش کنی

یہی سائنس جس کی بے پناہ ترقی نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے اگر اسے مسلمان بنا لیا جائے اور اس کی بے رہروی کی گردن پر قرآن کی تلوار رکھ دی جائے تو یہی دنیا جنت بن سکتی ہے۔ لیکن جس قوم کے ہاتھ سے یہ کام سرانجام پا سکتا تھا، اس کا اپنا کیا حال ہے۔

رفت سوز سینہ تا تار و کُرد یا مسلماں مرد یا قرآں بمرد

"قرآں بمرد" کی شرح سعید حلیم پاشا کی تقریر سے ہوتی ہے کہ جن ہاتھوں میں قرآن ہے وہ قطعی طور پر قرآن کی قوت سے بہرہ و بیگانہ ہیں۔

مکتب و ملا و اسرار کتاب کور مادر زاد و نور آفتاب

مُلّا کی آنکھ میں روشنی نہیں، اس کا ذوق سلیم نہیں، اس کی زندگی بیہودہ بحث و مناظرے کے لئے وقف ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ امت پارہ پارہ ہو کر رہ گئی ہے،

کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد ملت از قال و اقولش فرد فرد

وہ قرآن فہم نہیں ہے، قرآن فروش ہے،

از شگرفیہائے آں قرآں فروش دیدہ ام روح الامیں را در خروش

دین نبیؐ کی زندگی بخش حکمتوں سے ملا قطعاً ناواقف ہے اور قرآنی انوار سے محروم، غار ظلمات میں ٹامک ٹوئیے مار رہا ہے۔

بے نصیب از حکمتِ دینِ نبی آسمانش تیرہ از بے کوکبی

ملا کے صد رنگ و ہزار شیوہ مذاہب نے قوم میں ایک مستقل فساد برپا کر رکھا ہے۔ کفار مسلمانوں کو ختم کرنے کیلئے جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں اور ملا زدہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کو مٹانے کے درپے ہو رہے ہیں:

دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

مرحوم علامہ اس سے زیادہ فاش تنبیہ اور کیا کر سکتے تھے ـــــــ افغانی کی زبان سے وہ بار بار قوم کو قرآن کی دعوت دیتے ہیں۔

دل بآیات مبیں دیگر بہ بند   تا بگیری عصر نو را در کمند

کس نمی داند ز اسرار کتاب   شرقیاں ہم غربیاں در پیچ و تاب

یعنی اس نئے زمانے کے لئے جس دستور و آئین کی ضرورت ہے وہ ملاؤں کی تصنیف کردہ کتابوں سے حاصل نہیں ہوگا۔ اس کیلئے اسرار کتاب کے چہرے سے نقاب اٹھانا ہوگا ــــ اس وقت مسلمان جو کچھ کر رہا ہے وہ سراسر قرآن کے خلاف ہے، قرآن اگر کعبے کی طرف لے جانا چاہتا ہے تو قوم کا قافلہ ملا کی قیادت میں ترکستان کی طرف جا رہا ہے۔

منزل و مقصود قرآں دیگر است   رسم و آئین مسلماں دیگر است

بندہ مومن ز قرآں برنخورد   در ایاغ او نہ مے دیدم نہ دُرد

ملت روسیہ جو اس وقت ایک نئے تجربے کی جولاں گاہ بن رہی ہے، جس نے فرنگ کی جدتوں کو بھی تقویم پارینہ بنا دیا ہے، پیغام افغانی میں ان کو مخاطب کیا ہے۔

اے کہ می خواہی نظام عالمے   جُستۂ او را اساس محکمے؟

داستان کہنہ شستی باب باب   فکر را روشن کن از ام الکتاب!

قرآن کو چھوڑ کر اپنے تحفظ و دفاع کے لئے جتنے اسباب بھی فراہم کئے جائیں گے ان کا نتیجہ خیر نہیں نکلے گا،

جز بقرآں ضیغمی روباہی است   فقر قرآں اصل شاہنشاہی است

فقر قرآں اختلاط ذکر و فکر   فکر را کامل ندیدم جز بذکر

قرآن ہی ہے جو قارونوں اور فرعونوں کا صحیح علاج کرتا ہے اور دنیا کو ان کے چنگل سے نجات دلاتا ہے۔

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغام مرگ   دستگیر بندہ بے ساز و برگ

قرآن ہی ہے جو بے شمار مصنوعی تقدسوں کے دام سے رہائی دیتا ہے۔

نقش قرآں تا دریں عالم نشست   نقشہائے کاہن و پاپا شکست

یہ ہمارے بڑے بڑے فقہا و محدثین جن کی کتابوں کو ہم نے قرآن پر سوار کر رکھا ہے، صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی ہم انہی کی نظر سے اسلام کو دیکھنے پر مجبور کئے جا رہے ہیں۔ (معاف فرمائیے۔ خود ان کی اپنی مرضی کے خلاف) کیا ہم نے انھیں کاہن و پاپا کا درجہ نہیں دے رکھا ہے؟ قرآن جو انقلاب عظیم ہمارے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے، کیا ہم انھیں کتابوں کی "برکت" سے اس سے محروم ہو کر وقف جمود نہیں ہو رہے؟

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

میرے عزیز مسلمان بھائیو! مجھے صاف کہنے دو کہ ہماری موجودہ شریعت اور ہمارا مروجہ طور و طریق قطعاً وہ نہیں جسے حضرت محمد رسول اللہ صلعم نے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں رائج کر کے ہزاروں برس کی موت کو زندگی میں تبدیل کر دیا تھا۔

آفریدی شرع و آئینے دگر اندکے با نور قرآنش نگر

اگر ہم قرآن کی عینک آنکھ پر لگا کر دیکھیں گے تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ملاّ نے ہم کو جو کچھ دیا ہے وہ سراسر اس کے خلاف ہے جو محمدؐ نے دیا تھا۔

اس وقت ہماری روحیں قرآن کے سرور سے محروم ہیں اور ان بڑے بڑے نامی گرامی اداروں اور ان کے تعلیم یافتوں میں کوئی نہیں جو قرآن پر مطمئن ہو اور قوم کو اس کی طرف دعوت دے، حالانکہ اس کے اندر آج بھی وہی زندگی موجود ہے جو عہد رسالت میں تھی۔

محفل ما بے مے و بے ساقی است ساز قرآں را نواہا باقی است

وقت پکار رہا ہے، وقت کی ضرورتیں چلا رہی ہیں،

معنی تازہ کہ جوئیم و نیابیم، کجاست؟ مسجد و مکتب و مے خانہ عقیم اندہمہ

جن فرسودہ کتابوں کو دین سمجھا جا رہا ہے، جنھیں ملاّ چھاتی سے چپکائے پھر رہا ہے، جن کے خلاف وہ ایک حرف سننے کی تاب نہیں رکھتا، جن میں وہ دستور پاکستان بنانے کیلئے بے تاب ہو رہا ہے ان کی حقیقت کیا ہے،

رشتۂ دیں چوں فقیہاں کس نرشت کعبہ را کردند آخر خشت خشت

یہ ہفتاد و دو ملت کی ابدی معرکہ آرائی انھیں کے دم سے ہے۔ اگر آج ان کو ان کے اصلی مقام پر رکھ دیا جائے تو دنیا کی کوئی قوت مسلمان کے مقابل میں ٹھہر نہیں سکتی۔

در کمر تیغ دو رو قرآں بدست تن بدن، ہوش و حواس اللہ مست
ایں دو قوت حافظ یک دیگر اند کائنات زندگی را محور اند

مومناں را تیغ با قرآں بس است

ہمارے کاہن و پاپا نے تیغ کا استعمال حرام قرار دیا (اکثر نے عملاً اور بعض نے قولاً بھی) اور قرآن کو "بس" نہ سمجھ کر اس پر بے شمار اضافوں کا بوجھ لاد دیا۔ علامہ نے ان اضافوں کو "غیر قرآں" کا خطاب دیا اور ان سے پوری بیزاری کا اعلان کیا:

گر بحرفم غیر قرآں مضمر است در دلم آئینہ بے جوہر است

تنگ کن رخصت حیات اندر برم ... اہل ملت را نگہدار از شرم
گر دُرِ اسرار قرآں سفتہ ام ... با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
اے کہ از احسانِ تو ناکس کس است ... یک دعایت مزدِ گفتارم بس است

یہ چند اشعار "رموز" کے کئی شعروں سے منتخب کئے گئے ہیں جو "عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمین" کے زیر عنوان لکھے گئے ہیں ان میں علامہؒ نے اپنے آپ کو قرآن اور صرف قرآن کا ترجمان ظاہر کیا ہے ۔۔۔۔ علامہ کی تحقیق یہ ہے کہ قوم کے صوم وصلوٰۃ کی بے تاثیری اور خودی کی موت کا تنہا سبب حرارت قرآنی کا فقدان ہے۔

روح چوں رفت از صلوٰۃ و از صیام ... فرد ناہموار وملت بے نظام
سینہ ہا از گرمئ قرآں تہی ... از چنیں مرداں چہ امید بہی ؟
از خودی مرد مسلماں درگذشت ... اے خضر دستے کہ آب از سر گذشت!

"نژادِ نو" کے عنوان سے انہی نونہالانِ امت کو جو طویل پیغام دیا ہے اس کی روح یہی ایک شعر ہے جس سے پاکستان کا مستقبل وابستہ ہے۔

مردِ مومن را عزیزا اے نکتہ رس ... چیست جز قرآن و شمشیر و فرس؟

قرآن اور جہاد کی دعوت دیتے ہوئے وہ اس نکتے سے نوآموز طبقے کو آگاہ کردینا چاہتے ہیں کہ قرآن فہمی کے لئے عصر حاضر کے علما وصوفیا پر اعتماد نہ کر بیٹھیں۔ کیونکہ اگر وہ قرآن شناس ہوتے تو قوم اس زبوں حالی تک نہ پہنچتی۔

عالماں از علم قرآں بے نیاز ... صوفیاں درندہ گرگ و مو دراز
بے خبر از سرِ دیں اند ایں ہمہ ... اہل کیں اند، اہل کیں اند ایں ہمہ

اس سے بھی زیادہ فاش گوئی سے کام لیتے ہیں:

خیر و خوبی بر خواص آمد حرام ... دیدہ ام صدق و صفا اندر عوام

ایسی صورت میں چارۂ کار کیا ہو؟ سچائی کی تلاش کس آستاں سے کی جائے؟ اس سوال کا جواب سنئے:

اہلِ دیں را باز داں از اہل کیں! ... ہم نشینِ حق بجو، با او نشیں!

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ بصیرت کو علم تھا کہ ساری دنیا مل کر قرآن کا مثل تیار نہیں کرسکتی۔ اس آسمانی نور کے سامنے کسی کا دیا نہیں جل سکتا۔ لیکن ممکن ہے کہ کچھ لوگ چور دروازے سے گھس آئیں اور قوم کے سامنے کوئی "مثلہ معہ" کی قسم کی چیز بنا کر رکھ دیں اور یوں اسے قرآن سے برگشتہ کردیں۔ چنانچہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ آپ کے اقوال شوق وعقیدت کے ہاتھوں سے لکھے جارہے ہیں تو آپ نے حکماً فرمایا من کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ جس نے مجھ سے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہے، اسکو مٹادے (صحیح مسلم)

اسی پر بس نہیں کی، اور سنئے۔ کنا نکتب ما نسمع من النبی صلعم فخرج علینا فقال ما ھذا تکتبون فقلنا ما نسمع منک فقال "اکتاب مع کتاب اللہ امحضوا کتاب اللہ واخلصوا" قال فجمعنا ما کتبناہ فی صعید واحد ثم احرقناہ۔ یعنی ہم (بعض صحابہ) آپ سے جو کچھ سنتے لکھ لیتے تھے۔ ایک دن آپؐ تشریف لائے اور فرمایا "کیا لکھتے ہو؟" عرض کیا "آپ کے ارشادات" فرمایا "کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ دوسری کتاب ہے؟" (یعنی ایسا نہ کرنا چاہئے، پھر فرمایا) ستھری کرو اللہ کی کتاب اور ہر شبہ سے پاک رکھو"۔ پھر ہم نے جو کچھ لکھا تھا ایک میدان میں لاکر جلا دیا[1]۔

آخر آپؐ کا اندیشہ صحیح ثابت ہوا اور قرآن کی مثل تیار ہوئی نہ صرف ایک بلکہ کئی مثلیں بنیں اور بھولی بھالی قوم نے سب کچھ اپنے محبوب پیغمبر کی چیز سمجھتے ہوئے سر پر اٹھا لیا۔ اس کا بدیہی نتیجہ یہ نکلا کہ قوم کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی، شان دار ماضی قبر کی نیند سو گیا اور دوامی مصائب و حوادث کا دور شروع ہوگیا۔ ہمارے ہر مخلص مصلح نے قوم کو اس غلط روش کے خلاف جھنجھوڑا، اور علامہ مرحوم نے سب سے زیادہ تنبیہ و تلقین کا دریا بہا دیا، لیکن ہم ضلالِ بعید میں بڑھتے بڑھتے قرآن سے اتنے دور ہو گئے کہ واپسی کی کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی۔ لیکن بایں ہمہ، مسلمان نے جب بھی یہ فیصلہ کیا کہ اسے عزت کی زندگی بسر کرنی ہے تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوگا کہ وہ قرآن کی طرف لوٹے۔ اور ایک مسلمان ہی پر کیا موقوف ہے، تمام نوعِ انسانی کو ایسا ہی کرنا ہوگا۔ بقول مفتی اعظم فلسطین۔

> دنیائے اسلام کو آج کل جن مشکلات کا سامنا ہے وہ اس حقیقت کا نتیجہ ہیں کہ مسلمانوں نے **قرآن کریم کے بتائے ہوئے راستے کو ترک کر دیا ہے**۔ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے اور اس کے اصول ہر جگہ اور ہر زمانے کیلئے ہیں۔ اسلام اب بھی انسانیت کو بچا سکتا ہے اور دنیا کی موجودہ برائیوں اور مصائب کو ختم کر سکتا ہے۔ . . . . . (کراچی کی تقریر مورخہ ۱۹ اپریل)

علامہ اقبالؒ نے اپنے منظوم کلام کے علاوہ خطبات مدراس میں اس مبحث پر سنجیدگی سے بحث کی ہے کہ قرآن کے ساتھ جو احادیث کا ذخیرہ ہے، اس کا حقیقی مقام کیا ہے، چنانچہ پہلے شاہ ولی اللہؒ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالم گیر اصول عطا کر دے، لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کیلئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں، لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالم گیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے، اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشری زندگی کو اپنے سامنے

---

[1] یہ مسند احمد کی روایت ہے اور مجمع الزوائد کے حوالے سے برہان دہلی جلد ۲۴ نمبر ۳ صفحہ ۱۳۳ پر نقل کی گئی ہے۔

رکھتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے اس طرزِ کار کی رو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خود مقصود بالذات نہیں ہوتی انھیں آئندہ نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے اصول فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی فقہ کا مدار احادیث پر کیوں نہیں رکھا .... ان حالات کی روشنی میں (میں (اقبال) بھی یہی سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

(خطبات اقبال ص ۱۶۴-۱۶۳)

حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ اور علامہ اقبالؒ کے متفقہ و مصدقہ طریق کے خلاف قوم کو ایسے راستے پر ڈالا گیا جس کا نتیجہ لقینی طور پر ہلاکت ہونے والا تھا۔ چنانچہ اشاعۃ السنہ ج ۳ ص ۲۹۶ کے حاشیہ پر مرقوم ہے۔

ہرچند قرآن کریم مرتبہ ثبوت میں حدیث سے مقدم ہے۔ مگر حدیث صحیح منصب و خدمت تشریح و تفسیر میں قرآن سے مقدم ہے۔

اس کے علاوہ ص ۳۸ پر لکھتے ہیں:

قال امام الشعرانی: اجمعت الائمۃ علی ان السنۃ قاضیۃ علی کتاب اللہ

امام شعرانی فرماتے ہیں کہ اس پر ائمہ کا اجماع ہے کہ سنت، کتاب اللہ پر حاکم ہے۔

یہ فقرہ جس پر اجماع کیا گیا ہے کیا زمانۂ صحابہؓ اور عہدِ رسالتؐ میں برداشت کیا جاسکتا تھا؟ کیا ان بزرگوں کے خواب و خیال میں بھی یہ بات آسکتی تھی کہ اللہ کی کتاب پر کوئی چیز حاکم و قاضی ہوسکتی ہے؟ کیا وہ اپنے محبوب پیغمبرؐ کی ساری زندگی کے طرزِ عمل اور بالخصوص آپؐ کے آخری خطبۂ حج کے یہ الفاظ فراموش کر سکتے تھے؟

میں تم میں ایک چیز چھوڑے جاتا ہوں، اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو پھر کبھی گمراہ نہ ہوگے اور وہ خدا کی کتاب ہے۔

(رحمت عالم ص ۱۳۶ - علامہ سید سلیمان ندوی)

اب حدیث کو قرآن پر سوار کرنے کے لئے کہا یہ جاتا ہے کہ حدیث کے بغیر قرآن کو سمجھنا ناممکن ہے، حالانکہ قرآن ہی سے آفتاب کی طرح ثابت ہے کہ کفار و مشرکین میں ایسے لوگ تھے جو سمجھنے کے بعد انکار کرتے تھے۔ اگر ہم اس موضوع پر قلم اٹھائیں تو اپنے عنوان سے

دور جا پڑیں گے۔ صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ قرآن کی اس شہادت کا اعتراف ان لوگوں کو بھی کرنا پڑتا ہے جو حدیث کو دین کا درجہ دیتے ہیں، چنانچہ "برہان" دہلی کی یہ سطور دیکھئے:۔

جن لوگوں کے سامنے قرآن حکیم نازل ہوا ان کا اس کے اعجاز و تاثیر سے غیر معمولی طور پر متاثر ہونا، دل و زبان سے اس کا اقرار کرنا، اس کی تحدی و مقابلہ میں عاجز ہونا اور تمام کفار و مشرکین کا اس کے مطالب و معانی کو سمجھ لینا تاریخی بداہت کا ایسا روشن واقعہ ہے کہ جس کا کوئی اہل علم و عقل موافق و مخالف انکار نہیں کر سکتا۔

آگے چل کر لکھتا ہے:

قرآن پاک ایک قطعی اور یقینی چیز ہے اور اس کے معانی و مطالب بھی بیّن اور روشن ہیں اور یہ اپنے دعویٰ و مدعا اور برہان و دلیل میں محکم و مستحکم ہے نیز یہ کہ آپ اپنے مقصود و مدعا کے لئے کافی وافی ہے اور اس کا مطلب بغیر روایات و اخبار اور احادیث و آثار کے ملائے خود اس سے ہی سمجھ میں آتا اور آسکتا ہے جو اپنے مفہوم کے اظہار میں کسی خارجی ضمیمہ اور بیرونی مدد کا محتاج نہیں اور اس کا مقصود و مدعا اور مفہوم و مطلب، ترجمہ و معانی اپنی ذات میں کامل اور مکمل و مفید ہیں، ناقص و ناتمام، نامکمل و غیر مفید یا کسی دوسری چیز پر موقوف نہیں۔

(برہان دہلی جلد ۲۴ نمبر ۳۔ مضمون خواجہ سید محمد علی شاہ صاحب اسحاقی)

قرآن پاک کو اس سے نیچے کوئی مقام دینا نہ صرف قرآن کے ساتھ انتہائی بے انصافی ہے بلکہ خود اپنے ساتھ بھی بھیانک قسم کا ظلم ہے۔ اسی طرح روایت و اخبار اور حدیث و اثر کے اس ذخیرے کو جو زیادہ تر منسوب الی الرسولؐ، کم تر روایت بالمعنیٰ اور الشاذ کالمعدوم بلفظہٖ (صلعم) پایا جاتا ہے، مثلہ معہ کی کرسی پر بٹھا دینا فانی انسانوں (راویوں اور روایت سازوں) کو خدا مان لینے کے مترادف ہے۔

ہم علامہ مرحوم کے دین و مسلک کے متعلق غور کرتے کرتے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ یہاں تک ہم نے ان کے اپنے نظم و نثر کے بیانات کا خلاصہ پیش کیا ہے، آخر میں ان کے ایک سوانح نگار "اقبال کامل" کے مصنف مولانا عبدالسلام ندوی کی تحقیق سے استفادہ کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ علامہ کے "ذاتی حالات" کے تحت "مذہب" کا بعنوان قائم کر کے لکھتے ہیں:

یورپ سے پلٹنے کے بعد انھوں نے (یعنی اقبال نے) جس مذہب کی تبلیغ کی وہ فرقہ آرائی سے بلند تھا، وہ اس اسلام کے داعی تھے جس کی دعوت خود قرآن مجید نے دی تھی یعنی وہ (علامہ اقبال) اہلِ قرآن تھے لیکن اپنے آپ کو اہلِ قرآن[1] کہنا بھی ایک قسم کی فرقہ پسندی تھی اس لئے انھوں نے کبھی اپنے آپ کو اہل قرآن کی طرف منسوب نہیں کیا، تاہم ان کے اشارات بلکہ تصریحات

---

[1] علامہ مرحوم کی روش عین مطابق قرآن ہے، قرآن کریم سے اہل قرآن یا کسی بھی نام سے فرقہ بنانے کی اجازت نہیں نکلتی۔ اسلام کا ہر پیرو مسلم ہے اور بس۔ * سماکم المسلمین من قبل و فی ھذا۔

سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب کے متعلق ان کا عروۃ الوثقیٰ صرف قرآن تھا۔ مثنوی رموزِ بے خودی میں فرماتے ہیں:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن
صوفی پشمینہ پوش حال مست — از شراب نغمہ قوال مست
آتش از شعر عراقی در دلش — در نمی سازد بقرآں محفلش
واعظ دستان زن افسانہ بند — معنی او پست و حرف او بلند
از خطیب و دیلمی گفتار او — با ضعیف و شاذ و مرسل کار او
از تلاوت بر تو حق دارد کتاب — تو ازو کامے کہ می خواہی بیاب

یعنی جس طرح صوفی قرآن مجید کو چھوڑ کر شعر و سخن کے نشے میں سرشار ہو رہا ہے، اسی طرح مولوی قصہ کہانی اور اقسام حدیث کے چکر میں گرفتار ہے۔ جس چیز کی تلاوت مسلمان پر فرض کی گئی ہے وہ صرف کتاب اللہ ہے۔ ہر ضرورت اور ہر مقصد صرف اسی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد "اقبال کامل" کے محترم مصنف نے راقم سطور (عرشی) کا ایک مکالمہ علامہ مغفور سے نقل کیا ہے۔

اس باب میں (یعنی علامہ کے اہلِ قرآن ہونے کے باب میں) ان کی گفتگوئیں اور زیادہ واضح ہیں۔ عرشی صاحب "البیان" دسمبر ۱۹۳۹ء صفحہ ۱۹ میں لکھتے ہیں کہ "ایک بار ان (اقبال) سے میں نے پوچھا اسلام بتمامہ قرآن میں محصور ہے یا نہیں؟ فرمایا "مفصل کہو"۔ میں نے کہا "خارج از قرآن ذخیرہ احادیث و روایات اور کتب فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے"۔ انھوں نے فرمایا یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں ان کی بھی ضرورت ہے اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ کن ضروریات کے تحت وضع کی گئیں، لیکن نفسِ اسلام قرآن مجید میں بتمام و کمال آچکا ہے خداوند تعالیٰ کا منشا دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔

ایک اور گفتگو میں جو انھوں نے ایک غالی اہلحدیث سے کی فرمایا کہ "میں (اقبال) اعتقادی امور میں صرف قرآن پر انحصار رکھتا ہوں اور حدیث کے متعلق مجھے اور آپ سب کو خوب معلوم ہے کہ کن ذریعوں سے ہم تک پہنچی ہے۔

(اقبال کامل ص ۵۵ و ۵۶)

اسی کتاب میں آگے چل کر "عقائد" کے عنوان سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا ایک حوالہ دیا ہے۔

مغربی تعلیم و تہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ (اقبال) جتنا مسلمان تھا، اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا، اس کی گہرائیوں میں جتنا اترتا گیا اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہ میں جب پہنچا

تو دنیا نے دیکھا کہ وہ (اقبال) قرآن میں گم ہو چکا تھا اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی نہیں رہا وہ جو کچھ سوچتا تھا قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا، جو کچھ دیکھتا تھا قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا۔

اس اقتباس کے بعد محترم مصنف لکھتے ہیں :-

اس بنا پر انھوں نے (یعنی اقبال نے) اپنے عقائد کی بنا تمامتر قرآن مجید پر رکھی چنانچہ انھوں نے ایک موقع پر فرمایا کہ

"میں اعتقادی امور میں صرف قرآن پر انحصار رکھتا ہوں" (اقبال کامل ملا)

اس مقالے کے راقم (عرشی) کو ان لوگوں پر بے حد تعجب ہوتا ہے جو اقبال کے اعتماد علی القرآن کی تحسین کرتے ہیں اور خود قرآن سے بدکتے ہیں، چمنستان وحی کی گلگشت کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر کی جھاڑیوں میں سر چھپاتے پھرتے ہیں، اپنی اس روش سے قوم کو مختلف و متضاد راہوں پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں اور داعیانِ قرآن پر آوازے کسنے اور فتوےٰ تراشی کرنے سے نہیں چوکتے۔

یاد رکھو! پاکستان کے قیام و دوام کا راستہ وہی ہے جس کی طرف پیغمبر اسلام صلعم نے دعوت دی۔ جس پر صحابہ رضوان اللہ علیہم چلے، اور آخری زمانے میں جس کی تشریح و تبئین میں اقبال نے اپنی عمر کا بہترین حصہ صرف کیا۔ اقبال مسجد و خانقاہ سے مایوس ہے، وہ نوجوانوں کے نئے خون اور نئی امنگوں کو مخاطب کرتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے نوجوان قرآن عزیز کی قدر و قیمت کو سمجھیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

طلوع اسلام کے پرانے پرچے

اکثر نئے خریدار طلوع اسلام سے متعارف ہو کر تمام پرانے پرچوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اسی طرح بعض پرانے خریدار اپنا فائل مکمل کرنے کے لئے گم شدہ پرچوں کے لئے فرمائشیں بھیجتے رہتے ہیں۔ ایسی فرمائشوں کو حتی الوسع رد نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ کئی پرچے ایسے ہیں جن کا ادارہ کے پاس ایک نسخہ بھی نہیں بچا، اس کے باوجود تقاضے جاری ہیں۔

لھذا

اگر کسی صاحب کے پاس طلوع اسلام کے پرانے پرچے فالتو ہوں تو وہ ازرہ کرم ان کی تعداد اور تفصیل سے ادارہ کو مطلع فرمائیں۔

گلِ اقبال نگۂ بہار میں

(محترم ممتاز حسن صاحب کے شکریہ کے ساتھ۔ طلوع اسلام)

[گذشتہ سال یومِ اقبال پر طہران میں ایک یادگار جلسہ منعقد کیا گیا جس میں منجملہ اور حضرات کے ملک الشعرا بہار نے اقبال پر ایک تقریر فرمائی۔ آقائے بہار ایران کے شہرۂ دوراں شاعر خیر ملک کے ملک الشعرا ہی نہیں، اس کی جنگ آزادی کے مجاہد بھی ہیں۔ انھوں نے شاعرِ مشرق کے متعلق جن جذبات وخیالات کا اظہار فرمایا ہے، اور جو توقعات پاکستان اور اسلامیانِ پاکستان سے وابستہ کی ہیں وہ اس قابل ہیں کہ ہم انھیں مستقل طور پر پیشِ نظر رکھیں۔ اقبال اور اس کے پیغام کی اہمیت کا ادراک ملک الشعرا بہار نے جس خلوص اور عقیدت سے کیا ہے، اس کی نظیر میرے سامنے نہیں ہے۔ جزاک اللہ کیا خوب فرمایا ہے:

عصرِ حاضر خاصۂ اقبال گشت ۔۔۔ واحدے کز صد ہزاراں بر گذشت

شاعراں گشتند جیشے تار و مار ۔۔۔ ویں مبارز کرد کارِ صد سوار

میں نے آقائے بہار کی اس زندہ جاوید تقریر کا جو مجلہ "دانش" طہران میں شائع ہوئی تھی آزاد ترجمہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ ایران کے دورِ حاضر کا سب سے بڑا شاعر اقبال کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ممتاز حسن]

جب کسی سیاستداں کے دل میں کسی دوسرے ملک کا خیال آتا ہے تو سب سے پہلے اس کی نظر اس ملک کے طبیعی اور معدنی ذخائر پر پڑتی ہے یا ان سیاسی رعایات پر جو وہاں سے حاصل کی جا سکتی ہوں۔

جب کوئی تاجر یا سرمایہ دار کسی دوسرے ملک کا خیال دل میں لاتا ہے تو سب سے پہلے یہ سوچتا ہے کہ اس ملک میں تجارتی سہولتوں اور کاروباری لین دین کی کیا صورت ہے اور اس ملک میں نفع کیسے کمایا اور سیم و زر کیسے سمیٹا جا سکتا ہے۔

لیکن جب کوئی اہلِ نظر، شاعر، یا مردِ صاحبِ دل کسی ملک کے بارے میں غور کرتا ہے تو سب سے پہلے وہاں کے اہلِ علم اور اہلِ ہنر کے متعلق کچھ جاننا چاہتا ہے۔ اور وہاں کے تہذیب و تمدن، علم و ثقافت اور رسم و رواج کا جائزہ لینا چاہتا ہے۔ اسے

ملک کے سب سے بڑے شاعر اور اہلِ دل کی جستجو ہوتی ہے، کیونکہ کسی ملک کا حقیقی امتیاز سیاسی، تجارتی، زراعتی یا مالی فوقیت سے نہیں بلکہ اس ملک کے باشندوں سے ہے۔ باشندوں کا دقار ان کی تہذیب ان کے تمدن ان کی علمی اور ادبی تربیت اور ان کی زبان سے ہے۔ اور زبان و تہذیب کا انحصار زعمائے سیاست، ماہرانِ قانون، نامورانِ ادب اور مربیانِ علم و فن کے وجود پر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مادی طمع اور دنیوی اغراض سے بے نیاز ہو کر کسی قوم یا ملت کے حالات کا مطالعہ کرے تو بلاشک و شبہ اسے اپنی توجہ اس ملک کے زعمائے قوم اور پیشوایانِ ملت پر مرکوز کرنا ہوگی۔ خصوصاً اس صورت میں کہ خود اس کے اپنے ملک کا اس ملک سے گہرا اور قدیم ثقافتی اور تمدنی رابطہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ مجھے پاکستان کا خیال آتے ہی بے اختیار علامہ ڈاکٹر محمد اقبال طاب ثراہ یاد آجاتے ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ استقلال پاکستان و ہندوستان سے پانچ سال قبل جب اس سرزمین پر فرشتۂ امید بال فشاں تھا، میں نے سب سے پہلے دانش گاہِ طہران کے ہال میں علماء، ادبا اور بیرونی شعراء کے ایک ممتاز مجمع کے سامنے ایک نظم پیش کی، جس میں برصغیر ہند کے استقلال کی پیشگوئی کی گئی تھی۔ اس نظم میں کچھ تو ہندوستان کی گذشتہ اور موجودہ تاریخ کا بیان تھا اور کچھ اس ملک کے ادب و دست سلاطین و امراء اور فارسی گو شعراء کا تذکرہ تھا۔ اس ساری نظم سے جو ایران اور ہندوستان دونوں جگہ چھپ چکی ہے مقصود علامہ ڈاکٹر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف اور تعارف تھا۔

میرے نزدیک اقبالؒ کی شخصیت ہندوستان کے غازیوں، عالموں اور ادیبوں کے تہصد سالہ مجاہدے اور مساعی کا خلاصہ ہے اور اس نو سو برس کے لگائے ہوئے باغ کا میوۂ رسیدہ و کمال یافتہ۔ چنانچہ میں نے اپنی مذکورہ نظم میں اسلامی ہند کے دانش وروں اور ہنرمندوں اور سربرآوردہ بزرگوں کے ذکر کے بعد اقبال کے متعلق یہ کہا کہ:۔

عصرِ حاضر خاصۂ اقبال گشت — واحدے کز صد ہزاراں برگذشت
ہیکلے گشت از سخن گوئی بپا — گفت، کل الصید فی جوف الفرا
شاعراں گشتند جیشے تار و مار — وین مبارز کرد کار صد سوار

یہ ایک نہایت افسوسناک واقعہ ہے کہ استعماری سیاست کے طفیل سو سال سے کچھ اوپر ایسے گذرے کہ وہ طبیعی رابطہ جو ایران اور برادرانِ ہندوستان کے درمیان تھا منقطع ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ گاہ گاہ یہ کوشش بھی کی جاتی رہی کہ ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے درمیان دوستی، محبت اور حسنِ تفاہم کا جو رشتہ محکم ہے وہ خصومت اور عناد میں تبدیل ہو جائے۔ لیکن ایسی فتنہ کاری کبھی کامیاب نہیں ہو سکی۔ بلکہ اس کا خمیازہ انہی لوگوں کو بھگتنا پڑا جو اس کے محرک تھے۔

ہمیں اس حقیقت کا پتہ خاص طور پر اس وقت چلا جب پاکستان وجود میں آیا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس عظیم الشان

اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھے جانے کے بعد وہ پردۂ ضخیم و سنگفتِ صد و پنجاہ سالہ جو ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے درمیان حائل تھا یک بارگی اٹھ گیا اور ناگاہ ایسا محسوس ہوا کہ جدائی اور عدم آمیزش اور ماہرانہ تحریکات شیطانی کے یہ ڈیڑھ سو سال ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے روابط ہمدردی و ہمکیشی و ہم زبانی کو کم کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اس کی مثال بعینہٖ اس قطعۂ زمین کی سی ہے جس میں اچھے اور مفید قسم کے بیج بوئے گئے ہوں، مگر دھوپ اور پانی کی کمی واقع ہو گئی ہو اور ایک مدت اسی طرح گذر جائے کہ اس بار در زمین میں کوئی حرکت یا جنبش دیکھنے میں نہ آئے، پھر یک لخت نور سے حجابِ حائل اٹھ جائے اور دوسری سب رکاوٹیں بھی دور ہو جائیں۔ دھوپ، گرمی، رطوبت اور ہوائے کافی کے بہم پہنچنے سے اس زمین میں ایک طبیعی جوشش اور حرکت ہو اور اس کی قوت نامیہ اپنی اصلی حالت پر رجوع ہو کر طرح طرح کے خوش رنگ و خوشبو کلیاں، شگوفے اور پھول پیدا کرے۔

مجھے امید ہے کہ اب ہم اپنی گذشتہ تاریخ اور بزرگوں کی مساعی اور ہزار سالہ وحدت و یگانگی کے ثمرۂ گرانبہا سے بخوبی بہرہ ور ہو سکیں گے اور یہ دو سرسبز و شاداب گلشن اور بوستانِ تر و تازہ و پر نعمت (یعنی پاکستان اور ایران) پاکستانیوں کے دونوں بانیوں یعنی قائد اعظم جناح نور اللہ رمسہ اور علامہ ڈاکٹر محمد اقبال طاب ثراہ کی روح پر فتوح کی مدد و استعانت سے اور دونوں ملکوں کے اہل علم و ادب اور اہل فکر و دانش کی روز افزوں کوششوں کے طفیل یہ دونوں ملک ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو جائیں گے کہ ان کے درمیان کوئی ظاہری حدِ فاصل اور سیاسی تکلفات باقی نہ رہیں اور اس شاعر اعظم اور مصلح بزرگ کی سب سے بڑی امید اور آرزو یعنی وحدتِ مشرق کم از کم ایشیا کے ان دو زبردست دروازوں یعنی ایران اور پاکستان کی حقیقی یک جہتی کی صورت میں پوری ہو جائے۔

یہ بات ضرب المثل ہے کہ شاعر کے منہ سے نکلی ہوئی فال سچ ہوتی ہے۔ یہی بات ایران کے بارے میں ہم نے اپنے شاعر اور فلسفی ابوالقاسم فردوسی طوسی رضوان اللہ علیہ اور ان کے منہ سے نکلی ہوئی فال نیک میں دیکھی۔ ہم نے دیکھا کہ یہ فال جو بمنزلۂ الہام ایزدی تھی، کسقدر سچ نکلی۔ اور کس طرح فردوسی نے اپنے الہامی پیغام کی تاثیر اور آسمانی کلمات کی مدد سے ایک پراگندہ قوم اور تاراج ملک کو زندہ کر دیا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ عرصۂ عدم سے منصۂ وجود پر لے آیا۔ بالکل اسی طرح ہم نے پاکستان کے بارے میں بھی دیکھا کہ کس طرح تمام مخالفتوں اور منافرتوں کے باوجود اس ملہم من عند اللہ اقبال لاہوری کے نعرۂ جاں بخش اور نوائے دلکش سے فالِ نیک پیدا ہوئی اور اس کے کلام جاوید آثار کی تاثیر سے ایک زندۂ جاوید قوم اور ایک عظیم الشان مملکت وجود میں آئی۔ اگر ہم بھی اپنے پاکستانی بھائیوں کی طرح اس شاعر کی عظمت و فطانت کا مرتبہ پہچانیں اور اس نے جو زندہ اور پائندہ آثار چھوڑے ہیں ان کا اعتراف کریں تو یہ کچھ بے سبب نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہم ایرانی اپنے زبردست شاعر و فلسفی استاد فردوسی طوسی کو اسلامی ایران کا موجد و بانی سمجھتے ہیں، اسی طرح پاکستان کے

لوگ اقبال لاہوری رحمتہ اللہ علیہ کو جس کی یادگار آج رات اس جلسے میں منائی جارہی ہے پاکستان کے عظیم الشان ملک کا جو صلح مشرق کا ستون ہے موجد و بانی سمجھتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں ایران اور پاکستان باہمی ہمدردی، حسن تفاہم، روابط قلبی اور ایمان محکم و قوی کے سایئے میں ایشیا کے صلح و امن کو صحیح اور مضبوط اصول پر قائم کریں گے۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ قوموں کی وہ سعی و کوشش اور خواہش و آرزو جس کی بنیاد خیر و صلاح و منفعت عالم انسانی اور عمرانی اور تمدنی ترقی پر رکھی گئی ہو اس کا مقابلہ کوئی قوت نہیں کر سکتی۔ نامناسب نہ ہوگا کہ اس موقعہ پر میں اقبال کا ایک شعر آپ کے سامنے پیش کروں۔

فارغ از اندیشۂ اغیار شو
قوتِ خوابیدہ بیدار شو

مقامِ تشکر

علامہ اقبالؒ نے جب اردو کی جگہ فارسی کو ذریعۂ اظہار اختیار کیا ہے تو اس کی وجہ یہ بتائی تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ ان کا پیغام ہندوستان سے باہر کے مسلمانوں تک بھی پہنچے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سے واقعی ان کا پیغام حدودِ ہندوستان سے باہر پہنچ گیا۔ لیکن عربی ممالک، جو مسلمانوں کی بیشتر آبادی پر مشتمل ہیں، اس پیغام سے ناآشنا رہے۔ مقام مسرت ہے کہ یہ سعادت ایک عربی نژاد، ممتاز اہلِ قلم کے حصہ میں آئی۔ ہماری مراد، ہز ایکسیلنسی عبدالوہاب عزام بے زاد مجدہٗ سے ہے۔ عام طور پر لوگ انھیں سفیرِ مصر متعینہ پاکستان ہی کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن اہلِ علم حضرات سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ علمی دنیا میں آپ کی سطح کس قدر بلند ہے۔ آپ کو عربی شعر و ادب میں کامل دستگاہ حاصل ہے۔ فارسی بہت اچھی جانتے ہیں۔ اور بیکر اقبال کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اسی جذبۂ عشق کے ماتحت انھوں نے اردو سیکھی ہے اور اس طرح اقبال کے اردو کلام سے بھی واقف ہیں۔ عربی میں خود نہایت عمدہ شعر کہتے ہیں اور اسی جہت سے انھوں نے کلام اقبال کے متفرق حصوں کے علاوہ، پیام مشرق پورے کا پورا عربی نظم میں منتقل کیا ہے جسے مجلسِ اقبال (کراچی) نہایت تزک و احتشام سے چھپوا رہی ہے۔ امید ہے کہ یہ بے مثال تحفہ آئندہ یوم اقبال تک بادہ گسارانِ بزمِ اقبال کے ہاتھوں تک پہنچ جائے گا۔ جن احباب نے اس عربی ترجمہ کو دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ ترجمہ میں پیغامِ اقبال کی روح کو قائم رکھنے کے علاوہ، ان کے کلام کی شعریت اور شوکت کو بھی بہ حسن تمام برقرار رکھا گیا ہے۔ ہم محترم عزام بے صاحب کی خدمت میں اس قابلِ فخر کارنامہ پر، اور مجلسِ اقبال (اقبال سوسائٹی) کراچی کی خدمت میں اس سعیٔ محبت کو منصۂ شہود پر لانے پر، ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس ترجمہ سے عربی ممالک، دورِ حاضر کے اس مفکرِ اعظم کی بصیرتِ قرآن سے روشناس ہو سکیں گے۔ اس سے شاید دنیا کو اقبال کے اس استفسار کا جواب بھی مل جائے کہ

عرب کہ باز دہد محفلِ شبانہ کجاست؟

اقبال

آقای صادق سرمد شاعر ملی ایران

اگرچہ مرد بمیرد بگردشِ مہ و سال　　نمردہ است و نمیرد محمد اقبال

حیاتِ صورتش ار طی شدہ است، طے نشود　　حیاتِ سیرتش، ار طی شود ہزاراں سال

بیاد روز بزرگش کہ "روز اقبال" است　　درود باد بر ایں بزم در روزِ فرخ فال

درود باد بلاہور و خطۂ پنجاب　　کہ زاد و پرورد ایں شاعر خجستہ خصال

بزعم ہرچہ چمن زاد و ناز پرورد است　　زخاک مردہ دمید آیت جمال و جلال

زخاکِ مردہ دمید آیت حیات چنانک　　حیات دولت پاکاں ازاو گرفت کمال

چو شمع منزلِ ویراں خود نفس میسوخت　　کہ طوف سوزش پروانۂ زند پر و بال

چراغ لالہ شد و آنقدر بصحرا سوخت　　کہ شمع محفل اقبال گشت و روشن حال

زمام ناقۂ اسلام زی قطار کشید　　اگرچہ دست طبیعت بدو ندا د مجال

درست خواہی آغاز زندگی مرگ است　　کہ می کشند بمیزاں صحیفۂ اعمال

حدیث چشمۂ حیوان و دولتِ جاوید　　حقیقتی است کہ فہمش نمی کند جہال

زلال چشمۂ ایماں بنوش و باقی زی　　کہ آب چشمۂ حیواں از آں گرفت زلال

کسیکہ زندہ بحق شد چو حق نمی میرد　　کہ بر وجود و عدم حق و باطل است مثال

رجال حق ہمہ آیات ذات لم یزل اند　　حیات لم یزلی کے شود اسیر زوال؟

ببیں بصفحۂ تاریخ و حق مرداں بیں　　کہ نیست تاریخ، اِلّا مساعی ابطال

بطل شنیدی و نشناختی بطل زیراک — بطل شناس نه ای زآن سبب شدی بطال

بطل نه آنکه بآهنگ طبل خواند سرود — بطل نه آنکه بشیپور رزم شد طبال

بطل نه آنکه سپر کرد سینه بر باطل — که حق مردم بیدست و پا کند پامال

بطل کسیکه بروز بلا بلا جوید — که دفع شر کند از خیر خلق بد احوال

بطل کسیکه بشر را بحق هدایت کرد — که باطلش نکشاند بپرتگاه ضلال

چنیں بطل که ادا کرد حق خدمت خلق — خدای خود نکند حق خدمتش ابطال

درود باد برابطال حق که از دمشان — مسیح زنده شود روز رجعت آمال

قیام مرد خدا کمتر از قیامت نیست — که بعث ملت و دولت کند باستعجال

گواه دولت پاکاں ببیں بپاکستاں — که خود چگونه برافراشت پرچم اقبال

اگرچه قائد اعظم بنهضت پاکاں — جناح لشکر اسلام بود و قلب رجال

بحق دولت پاکاں عظیم خدمت کرد — عظیم باد اجرش ز ایزد متعال

ولیک نغمهٔ اقبال اگر نبود نبود — نوای لشکر پاکاں سرود استقلال

سخن سرای اقبال بذر دین افشاند — برغم دشمن بیدیں و کافر قتال

بخواں "زبور عجم" وز "رموز اسرارش" — "پیام مشرق" بشنو بخوشتریں اقوال

رسول وار به تبلیغ حق کتاب آورد — که قدر حق بشناسد منافق محتال

اگر کتاب نبود و اگر رسول نبود — چه بود قدرت ابطال و غیرت ابدال

درود باد بر اقبال و سعی مقبولش — که عزت ابدی آمدش باستقبال

سخن سرآمد و سرمد مجال شعر نداشت
دگرنه حق سخن بود و جای بسط مقال

(بتشکر مجلهٔ دانش. طهران)

سلیم کے نام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پرویز

سلیم! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں تمہارے ذہن پر غالب چھا رہا ہے۔ تمہارے اس اندازِ نگارش نے مجھے بھی ان بھولی بسری وادیوں کی یاد پھر سے تازہ کرادی۔ ہرچند ہمارے شعراء کے ہاں حقائق سے زیادہ لطائف ہوتے ہیں، لیکن ان میں غالب اپنی شانِ انفرادیت لئے بالکل الگ نظر آتا ہے۔ جس شعر کے متعلق تم نے پوچھا ہے' وہ یوں ہے:

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا — واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

غور کرو کہ میرزا کیا کہہ گیا ہے اور کس انداز سے کہہ گیا ہے۔ سچ کہا تھا اس نے کہ

گر عشق نہ بودے و غمِ عشق نہ بودے — ایں ہاسخن نغز کہ گفتے کہ شنودے؟

اس باب میں میری کیا پوچھتے ہو۔

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب — اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

ہٹاؤ ان قصوں کو اور اپنے خط کا جواب سنو۔

سلیم! مجھے تمہاری بیتابیٔ تمنا کا احساس ہے۔ لیکن تم بھی تو ذرا صبر طلبیٔ عشق پر نگاہ رکھا کرو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہاری کیفیت اب یہ ہو چکی ہے کہ ــــ نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لئے' لیکن میں اب بھی یہی کہوں گا کہ

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی — اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

جب تک افکار میں پختگی نہ آجائے، مقام دعوت و عزیمت کا قصد یا آرزو خیال خام ہی نہیں بلکہ حیات نمائی اور ہلاکت فروشی ہے۔ اور پختگیٔ افکار ناممکن ہے جب تک فکر کی ہر افتاد اس سرچشمۂ علم و یقین سے ہم آہنگ و یک رنگ نہ ہو جائے جس میں شکوک و اضطراب کو کوئی دخل نہیں اور جس کا آغاز سخن لاریب فیہ کے زلزلہ انگیز و کوہ تمثال دعویٰ حقیقت کشا سے ہوتا ہے۔ جن لوگوں کا تم نے نام لیا ہے ان کی تحریروں کا مسلسل مطالعہ کرو اور پھر دیکھو کہ ان میں کس قدر تضاد اور کیسا تخالف ہے، اس لئے کہ ان کا نقطۂ پرکارِ فکر، علمِ خداوندی نہیں بلکہ اپنے امیال و عواطف یا وراثتی نقوش و خطوط ہیں۔ ان میں سے بعض تو وہ ہیں جو اپنی . . .

مصلحت کوشیوں کے پیش نظر، دیدہ دانستہ ساحرین کی رسیوں کو موسیٰ کا اژدھا بنا کر دکھاتے ہیں تاکہ ان شعبدہ بازیوں اور فسوں سازیوں سے عوام کی نگاہوں میں واجب التکریم بن جائیں، اور بعض ایسے بھی ہیں جو اس موج سراب کو بیچ مچ چشمۂ حیواں سمجھ کر خود بھی فریب نفس میں مبتلا ہیں اور دوسروں کو بھی اس داستاں گوئی سے آسودۂ خواب رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن طائفہ اول ہو یا گروہ ثانی، ملت کے حق میں دونوں زہر ہلاہل ہیں۔ اسی فریب خوردگی کا نتیجہ ہے کہ وہی مسلمان جس کی محفلِ حیات کا کبھی یہ عالم تھا کہ

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب

اب اس کی ہر جگہ یہ کیفیت ہے کہ

گوش مہجور پیام و چشم محروم جمال

تمہارے استفسار کا تجزیہ کیا جائے تو وہ اُس سوال کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کی رو سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ مرغی پہلے تھی یا انڈا لیکن میرا خیال ہے کہ اگر تم ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو تو مرغی اور انڈے کے اس پریشان کن دائرے سے نکل جانا مشکل نہ ہوگا۔ تم کہتے ہو کہ اسلامی نظام ان لوگوں کے ہاتھوں چل سکتا ہے جن میں کیرکٹر ہو اور کیرکٹر والے لوگ آج موجود نہیں۔ انھیں اسلامی نظام ہی پیدا کرے گا۔ اس لئے آغاز کار کس طرح کیا جائے!

پہلے یہ دیکھو کہ کیرکٹر سے مراد کیا ہے؟ کیرکٹر ایک وسیع المفہوم اصطلاح ہے جس کے متعدد گوشے ہیں۔ لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ اسلامی نظامِ مملکت کے لئے جس کیرکٹر کی ضرورت ہے، آج وہ ناپید ہے، تو اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں خود غرضی اور بددیانتی اس قدر عام ہے کہ متاعِ ملت کسی کی امانت میں نہیں دی جا سکتی۔

اب سوچئے کہ خود غرضی سے مفہوم کیا ہے اور یہ کیوں پیدا ہوتی ہے؟ خود غرضی سے مراد یہ ہے کہ ہر فرد دوسروں کے مفاد پر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ مفادِ کُل کو انفرادی مفاد پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ قومی زندگی میں اسی کا نام فقدانِ کیرکٹر (Characterlessness) ہے۔ پھر سنئے! عدم کیرکٹر سے مفہوم یہ ہے کہ ہر فرد اپنے ذاتی مفاد کی فکر کرتا ہے اور مفادِ کُل کی قطعاً پروا نہیں کرتا۔ (اس فقرہ کے ایک ایک لفظ کو سلیم! الگ الگ دہراؤ۔ پھر بات ذہن نشین ہو سکے گی)

اب دیکھئے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ تم جانتے ہو کہ حفاظتِ نفس (Preservation of self) عقل کا تقاضا ہے۔ اس کا فریضہ ہی یہ ہے کہ یہ اس فرد کی ذات کا تحفظ کرے جس کی یہ عقل ہے، اور چونکہ عقل ہر فرد کی الگ الگ ہوتی ہے اس لئے ہر عقل کا فریضہ "اپنے فرد" کی ذات کا تحفظ ہے۔ اسی کا نام انفرادیت ہے، اور اسی سے خود غرضی پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے خود غرضی (Selfishness) ہر انفرادی عقل کا تقاضا ہے۔ عقل ہی نہیں بلکہ یہ تو جبلت (Instinct) کا تقاضا ہے۔ اسلئے انسان اور حیوان دونوں میں مشترک ہے۔ ہر حیوان اپنی ذات کے تحفظ کے لئے چارہ جوئی کرتا ہے۔ ایک خورد بینی جرثومہ سے لے کر

عظیم الجثہ ہاتھی تک، ہر ذی حیات بقائے ذات کی فکر میں مضطرب و بیتاب دکھائی دیتا ہے۔ لیکن حیوانات اور انسان میں ایک نمایاں فرق ہے۔ تم نے اپنے ہاں گائے کو دیکھا ہوگا۔ جب وہ بھوکی ہو اور اس کے سامنے چارہ ڈال دیا جائے تو وہ دوسری گائے کو پاس نہیں پھٹکنے دیتی۔ لیکن جب وہ پیٹ بھر کر کھا چکتی ہے تو نہایت اطمینان سے بیٹھ کر جگالی کرنے لگ جاتی ہے اور اس کی پروا تک نہیں کرتی کہ باقی ماندہ چارہ محفوظ رکھا ہے یا نہیں۔ یعنی اسے اپنی موجود بھوک کی فکر ہوتی ہے، مستقبل کی فکر نہیں ہوتی۔ (اس میں شبہ نہیں کہ بعض حیوانات، چیونٹیاں، مکوڑے وغیرہ مستقبل کے لئے بھی ذخیرہ جمع کرتے ہیں، لیکن ان کا یہ عمل اجتماعی ہوتا ہے انفرادی نہیں (یعنی ان کی اجتماعی جبلت اس قسم کی واقع ہوئی ہے، انفرادی عقل نہیں) لیکن انسانی عقل حال کی حفاظت سے مطمئن نہیں ہوتی بلکہ مستقبل کی صیانت کے بھی درپے رہتی ہے۔

سلیم! ذرا سوچو کہ انسان کو مستقبل کی فکر کیوں پیدا ہوتی ہے؟ تم بادنیٰ تعمق اس نتیجہ تک پہنچ سکو گے کہ اس فکر اور پریشانی کا محرک جذبہ احتیاج کا خوف ہے۔ یعنی ہر فرد کو خوف دامنگیر رہتا ہے کہ اگر میرے پاس کل کے لئے کھانے کو نہ ہوا تو میں کیا کروں گا۔ اس خوف کی وجہ سے ہر فرد کی عقل اسے اکساتی ہے کہ وہ کل کی فکر بھی آج ہی کر لے۔ اور چونکہ انسانی زندگی کا کل ..... (Future) غیر متعین ہے (کیونکہ کسی کو موت کے وقت کا علم نہیں) اس لئے ہر فرد یہ چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے لئے سمیٹ لے تاکہ وہ کل کی احتیاج کے خوف سے مامون ہو جائے۔ یہ ہے وہ جذبہ جس کے ماتحت ہر فرد اپنے لئے زیادہ سے زیادہ اکٹھا کرنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے۔ اسی کا نام خود غرضی ہے۔ جب ہر فرد اپنی اپنی فکر میں پریشان ہو تو سلیم! جانتے ہو کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ تم نے دیکھا ہوگا کہ جب پولیس کسی مجمع پر لاٹھی چارج کرتی ہے تو ہر شخص اپنے آپ کو بچانے کیلئے بھاگ اٹھتا ہے اور اس افراتفری (نفسا نفسی) میں ہوتا یہ ہے کہ جو شخص کہیں گر گیا کچلا گیا۔ اسے بھگدڑ مچنا کہتے ہیں۔ مجھے یاد آ گیا۔ تم نے خود ہی تو سنایا تھا کہ جب میونسپل ہال کے جلسہ میں پٹاخے کی آواز آئی تھی تو لوگ کس طرح اپنی اپنی جان کی فکر میں بدحواس ہو کر بھاگ اٹھے تھے اور اس بھگدڑ میں کتنے لوگ پاؤں تلے روندے گئے تھے۔ خود لاہور کی شاہی مسجد میں کتنے لوگ عید کی نماز کے "ہجوم مومنین"[1] میں پس کر مر گئے تھے۔ جس طرح ایسے مجمعوں میں بھگدڑ مچتی ہے، اسی طرح جب کسی معاشرے میں ہر فرد اپنی اپنی حفاظت کی فکر میں مصروف تگ و تاز ہو جائے تو اس معاشرے کا توازن بگڑ جاتا ہے، اور اس میں اس طرح کھلبلی مچ جاتی ہے کہ جو کمزور نیچے گرتا ہے وہ کچلا جاتا ہے۔ یہ ہے وہ معاشرہ جس میں کہا جاتا ہے کہ لوگوں میں کیرکٹر نہیں رہا، ہر شخص دوسرے کو لوٹنے کی فکر میں ہے۔

اب سمجھ لیا تم نے سلیم، کہ کیرکٹر کے فقدان کے کیا معنی ہیں؟ اور اس کی علت کیا ہے؟ کیرکٹر کی کمزوری کے معنی ہیں بے رحمی اور خود غرضی کا محرک جذبہ ہوتا ہے احتیاج کا خوف۔ یعنی یہ اندیشہ کہ اگر میرے پاس کچھ نہ رہا تو کل میرا یا میری اولاد کا کیا حشر ہوگا؟ اس میں

---

[1] عید آزاداں شکوہ ملک و دیں — عید محکوماں، ہجوم مومنیں

شبہ نہیں کہ کیرکٹر کی کمزوری کے بعض اور پہلو بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً ہوسِ اقتدار وغیرہ۔ لیکن اگر تم غور سے دیکھو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی حیثیت ثانوی ہے، بنیادی چیز وہی "احتیاج کا خوف" ہے۔ ہوسِ اقتدار بھی غیر شعوری طور پر اسی خوفِ احتیاج کی بڑھتی ہوئی شکل کا نام ہے۔ یعنی انسان احتیاج سے مامون ہونے کیلئے، اِدھر اُدھر سے سمیٹنے کی فکر کرتا ہے اور پھر اس سمیٹے ہوئے کی حفاظت کے لئے اقتدار کے قلعے بناتا ہے۔ سو وہ علتِ اولیٰ جو انسانی معاشرے میں بھاگڑ مچا دیتی ہے، ہر فرد کے دل میں احتیاج کے خوف سے مصئونیت (Security) کی فکر ہے۔ اور جس طرح ہر بھاگڑ میں، ہر فرد اپنی اپنی جان بچانے کی فکر میں ہوتا ہے اور اس فکر میں اس قدر بدحواس ہو جاتا ہے کہ اتنا بھی خیال نہیں کرتا کہ جو گر پڑا ہے اسے روند کر تو آگے نہ بڑھے، اسی طرح معاشرے کی اس توازن شکن بھاگڑ میں ہر فرد اپنے مفاد کے تحفظ میں مضطرب و پریشان رہتا ہے، کسی دوسرے کے مفاد کا قطعاً خیال نہیں کرتا۔ یہی کچھ افراد سے آگے بڑھ کر مختلف اقوام میں ہو جاتا ہے۔ یعنی ہر فرد کی طرح ہر قوم اپنے مفاد کی فکر میں رہتی ہے۔ دوسری قوم کے مفاد کا کوئی خیال نہیں کرتی۔

لیجئے، سلیم! مرض کی تشخیص تو ہو گئی۔ یعنی

۱) تحفظِ ذات عقل کا فریضہ ہے۔

۲) عقل اپنے اس فریضہ کی ادائیگی میں ہر وقت ایسے اسباب کی فکر کرتی رہتی ہے جن سے اس فرد متعلقہ کی حفاظت ہو جائے۔

۳) انسان عام حیوانات کی طرح، اپنی وقتی حفاظت پر ہی قانع نہیں ہو جاتا بلکہ مستقبل کی حفاظت بھی چاہتا ہے۔

۴) اس حفاظت کیلئے اسے ہر وقت یہ فکر دامنگیر رہتی ہے کہ اگر میں کل کو محتاج ہو گیا تو میرا یا میری اولاد کا کیا بنے گا۔

۵) احتیاج کی یہ فکر اسے ہر وقت مضطرب و پریشان رکھتی ہے اور اس طرح ہر فرد اپنے اپنے مفاد کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے اور اس دوڑ میں کسی دوسرے کے مفاد کا قطعاً خیال نہیں کرتا۔

۶) اسی کا نام خود غرضی اور کیرکٹر کا فقدان ہے۔

اب آؤ اس کے علاج کی طرف۔

علتِ مرض ہے احتیاج کا خوف۔ لہٰذا مرض کا علاج ہو گا اس خوف کا دل سے نکال دینا۔ سوال یہ ہے کہ یہ خوف دل سے نکالا کس طرح جا سکتا ہے۔

اگر ہر فرد کو اس امر کا پورا پورا یقین ہو جائے کہ اس کی کوئی ضرورت رکی نہیں رہ سکتی، اس کو کوئی احتیاج ستا نہیں سکتی، وہ کبھی بھوکا نہیں مر سکتا، اس کی اولاد کسی حالت میں بھی بیکس و بے بس نہیں رہ سکتی۔ یعنی اسے اس امر کا یقین ہو کہ اس کی اور اس کی اولاد کی تمام ضروریاتِ زندگی کا سامان موجود ہے، تو اس کے دل سے احتیاج کا خوف نکل جائے گا۔ تمہیں معلوم ہے کہ جس شخص نے زندگی کا بیمہ کرا رکھا ہو وہ کس قدر مطمئن ہوتا ہے۔ یزدانی کو دیکھو، کس طرح موت کو آوازیں دیتا پھرتا ہے۔ زندگی تو ایک طرف، جس دن سے

ملک نے دوکان کا بیمہ کرایا ہے، گھوڑے بیچ کر سوتا ہے، ورنہ اس سے پہلے چار میل پر فائر بریگیڈ کی گھنٹی اس کے ہوش و حواس گم کر دیا کرتی تھی۔ لہٰذا جب کسی فرد کے دل سے فکرِ احتیاج نکل جائے تو اس میں خود غرضی نہیں رہتی، اور جب خود غرضی نہ رہے تو خود بخود کیرکٹر پیدا ہو جاتا ہے۔

لیکن وہ یقین کس طرح سے پیدا کیا جائے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یعنی ہر فرد کے دل میں اس امر کا یقین کہ اس کی کوئی ضرورت رکی نہیں رہ سکتی، وہ اور اس کی اولاد کبھی بھوکی نہیں مر سکتی۔

یہ پیدا ہوگا اللہ پر ایمان لانے سے، اسے رازق ماننے سے، اس پر توکل کرنے سے۔ اس امر پر یقین رکھنے سے کہ ہر فرد کے رزق کی ذمہ داری اللہ نے اپنے سر لے رکھی ہے۔

میں یہ لکھ رہا ہوں اور تمہاری اس ہنسی کی آواز گوشِ تصور سے سن رہا ہوں جو ان فقروں سے بے ساختہ تمہارے لب پر آجائیگی۔ میں خود تمہاری اس ہنسی میں شریک ہوں۔

تم کہو گے کہ میں کیسی پہیلیاں کہہ رہا ہوں یعنی ایک طرف تو یہ کہہ رہا ہوں کہ یقین پیدا ہوگا اللہ کی رزاقیت کے ایمان سے، اور دوسری طرف یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ یہ باتیں ایسی ہیں جن سے بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے لیکن یہ پہیلیاں نہیں۔ ذرا سمجھنے کی کوشش کرو تو بات بالکل صاف ہے۔ ان الفاظ کا ایک مفہوم وہ ہے جو ملا کے مذہب نے تمہارے ذہن میں مرتسم کر رکھا ہے۔ وہ مفہوم فی الواقعہ ایسا ہے جس سے بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ لیکن انہی الفاظ کا ایک مفہوم وہ ہے جو خود ان الفاظ کے مصنف نے متعین کیا ہے۔ وہ مفہوم واقعی وہ یقین پیدا کر سکتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ مذہب نے جس خدا کو کائنات سے ماوریٰ عرش پر بٹھا رکھا ہے وہ واقعی کسی کے رزق کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ اس کے رزاق ہونے کے دعوے کے باوجود، اس کی خدائی میں کروڑوں بندے بھوکے سوتے اور لاکھوں انسان فاقوں سے مرتے ہیں۔ اس کے اس بلند آہنگ اعلان کے باوجود کہ وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا (۱۱) (زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو) آج آدھی دنیا کو پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہیں ہو رہی۔ لہٰذا مذہب کے پیدا کردہ "خدا" پر ایمان لانے اور اس کے دعاوی پر توکل رکھنے سے وہ یقین کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتا جو انسان کو احتیاج کی فکر سے بے خوف کر دے۔ یہی وہ "خدا" تھا جس کے متعلق مارکس نے کہہ دیا تھا کہ اس کا تصور سرمایہ داروں کی مصلحت کوشیوں کا پیدا کردہ ہے۔ لیکن خدا کے تصور کا ایک مفہوم وہ ہے جسے خود خدا نے متعین کیا ہے اور جو سلیم، قرآن کے حروف و نقوش میں جگمگ جگمگ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس تصور کی رو سے ان مقامات پر "خدا" سے مفہوم ہی وہ نظام جو اس کے متعین فرمودہ ابدی قوانین کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔

سلیم، اس کا تو علم نہیں کہ تکوینی دنیا میں خدا کی رزاقیت کا نظام کیا ہے۔ تم اپنی نانی اماں کی زبان میں یوں سمجھو کہ ہم نہیں جانتے کہ "وہ پتھر میں کیڑے کو کس طرح روزی پہنچاتا ہے"، لیکن انسانی دنیا میں اس کا دعوئے رزاقیت و ربوبیت اس نظام کی رو سے پورا ہوتا ہے جو اس کے قوانین کی بنیادوں پر خود انسانوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے۔ انسان کی دنیا میں مشیتِ خداوندی کی تکمیل انسانوں ہی کے

ذریعے سے ہوتی ہے۔ لہٰذا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر ایک کا رزق اللہ کے ذمے ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ نظام جو قوانینِ خداوندی کی رو سے قائم ہو، تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ نظام جس پر پورا پورا توکل (بھروسہ) کیا جا سکتا ہے۔ اور یہی ہے وہ نظام جو انسان کے اندر اس امر کا یقین پیدا کر سکتا ہے کہ میں بھوکا نہیں مر سکتا۔ میری اولاد تباہ نہیں ہو سکتی۔ اس نظام میں انسان احتیاج کی فکر سے بے خوف ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس نظام کی خصوصیتِ کبریٰ ہی یہ بتائی گئی ہے کہ اس کی ذمہ داری میں آجانے والوں کی کیفیت یہ ہوگی کہ لاخوف علیہم ولاھم یحزنون۔ انھیں نہ کسی قسم کا خوف رہے گا، نہ انھیں احتیاج کی فکر ستائے گی۔ (خافتہ اس چھے کو کہتے ہیں جسے چھتے میں سے شہد نکالنے والے پہن لیتے ہیں تاکہ شہد مل جائے اور مکھیوں کے کاٹنے کا ڈر نہ ہو) اسی نظام سے انسان کی دنیا اس جنت میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کے متعلق ابن آدم سے کہا گیا تھا کہ ان لك الا تجوع فیھا ولا تعرٰی وانك لا تظمؤا فیھا ولا تضحٰی (۲۰/۱۱۸) "اس میں نہ تو بھوکا رہے گا، نہ ننگا۔ نہ پیاسا رہے گا، نہ (بلا مکان کے) دھوپ میں"۔ اور یہ جنت بنے گی کس طرح سے؟ فاما یاتینکم منی ھدًی فمن تبع ھدای فلا یضل ولا یشقٰی (۲۰/۱۲۳) "ہماری طرف سے راہنمائی کے قوانین ملیں گے۔ سو جو ان قوانین کی اتباع کرے گا تو نہ اس کی کوششیں بے نتیجہ رہیں گی اور نہ اسے بھوک، لباس اور سردی گرمی کی تکالیف اٹھانی پڑیں گی۔ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون۔ انھیں احتیاج کا خوف دامنگیر نہیں ہوگا۔

سلیم، تم پہلے دیکھ چکے ہو کہ خود غرضی کا بنیادی سبب احتیاج کا خوف تھا اور اس خوف سے نجات کا ذریعہ اس نظام ربوبیت کا قیام ہے جو ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل ہوتا ہے، بلکہ اس میں کسی فرد کے دل میں احتیاج کا خوف پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اور جب انسان احتیاج کی طرف سے مامون ہو جاتا ہے تو خود غرضی باقی نہیں رہتی۔ اور جب خود غرضی باقی نہیں رہتی تو کیرکٹر خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ اب سمجھے سلیم کہ ہم میں آج کیرکٹر کیوں نہیں اور کیرکٹر پیدا کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ تم کہتے ہو کہ نظامِ ربوبیت کا قیام ان لوگوں کے ہاتھوں سے ممکن ہے جو کیرکٹر والے ہوں، اور چونکہ آج ہم میں کیرکٹر نہیں، اس لئے اس نظام کا قیام ناممکن ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ تم اس نظام کی ابتدا کر دو، کیرکٹر اس کے پیچھے پیچھے چلا آئیگا۔ تم خدا کی ربوبیت کو عام ہونے دو، پھر دیکھو کہ کس طرح

ذرہ، صحرا دستگاہ و قطرہ، دریا آشنا

کا منظر تمہارے سامنے آجاتا ہے اور انہی افراد کی سیرت میں کس قدر بلندیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اس نظام کے قیام کی پہلی منزل اس کیلئے شعور کی بیداری ہے۔ یہ احساس کی بیداری، یہ فکر و نظر کی تبدیلی، اس نظام کے تصور کے عام کرنے اور اس کے درخشندہ اور تابناک نتائج کو نگاہِ بصیرت کے سامنے لانے سے ہوتی ہے۔ اس کا نام تعلیم کتاب و حکمت ہے۔ نبی اکرمؐ نے اسی نقطہ سے آغازِ کار کیا (ویعلمھم الکتاب والحکمۃ) یعنی اس قانونِ ابدی کی تعلیم اور اس کی حکمت اور لم کی تفہیم (اس امر کی تعلیم کہ یہ قانون کیا ہے اور اسے کیوں رائج کرنا ضروری ہے۔) کتاب قانون کو کہتے ہیں اور حکمت ہوتی ہے (The Why of it)

اس تصور کو عام کرنے سے ایسے سعید فطرت لوگ نتھر کر الگ ہو جاتے ہیں جن کی نگاہوں میں کشادگی اور قلب میں وسعت کی استعداد ہوتی ہے۔ اسی کا نام نفس کی بالیدگی (تزکیہ) ہے۔ اور تعلیم کتاب و حکمت کے ساتھ اس کا چولی دامن کا تعلق ہے۔ (ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ)۔ اب یہاں سے سلیم! ایک دوسرا نقطہ شروع ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ اس تعلیم سے کونسی حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے جس سے انسان کی نگاہوں میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور وہ ذاتی مفاد کی تنگ وادیوں سے نکل کر اجتماعی مفاد کی اس جنت میں جا پہنچتا ہے جس کے متعلق فرمایا کہ عرضھا السمٰوٰت والارض (۳/۱۳۲) "اس کی وسعت تمام ارض و سما کو محیط ہے"۔ یہ بات ذرا غور سے سمجھنے کی ہے۔ جب بات چھیڑ دیتے ہو تو اسے پوری طرح سمجھ بھی لیا کرو۔

تم دیکھ چکے ہو کہ ہر فرد کی عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اس فرد کی ذات کا تحفظ کرے۔ اس لئے ہر فرد اپنے ذاتی مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے اور کسی اور کو اس مفاد میں شریک نہیں کرتا۔ لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ایک باپ اپنے مفاد کو اپنی ذات تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ اپنی اولاد کو بھی اس میں شریک کر لیتا ہے۔ یہ شراکت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ اس کا اپنا مفاد اس کی اولاد ہی کا مفاد بن جاتا ہے۔ وہ سب کچھ اپنی اولاد کیلئے کرتا ہے۔ اسے اپنے مستقبل کی فکر اس قدر نہیں ہوتی جس قدر اولاد کے مستقبل کی ہوتی ہے۔ اسے ہر وقت یہی اندیشہ ستاتا رہتا ہے کہ اگر میری موت بے وقت ہو گئی تو میری اولاد کا کیا بنے گا۔ تم نے سلیم! غور کیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے! وہی عقل جس کا فریضہ اس فرد متعلقہ کا تحفظ ذات تھا، ان "ماورائے ذات" افراد کی حفاظت نفس کے لئے اس درجہ مشوش و پریشان کیوں ہو گئی؟ اسلئے کہ یہ شخص (باپ) ان ماورائے خویش افراد (یعنی اولاد) کو خود اپنی ذات ہی کا جزو سمجھتا ہے۔ وہ ان میں اور اپنے آپ میں کچھ فرق نہیں کرتا۔ یہی جذبہ ہے جس کے تحت "گھر" (Home) کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ عائلی زندگی کی اساس و بنیاد یہی ہے۔ اس زندگی کی ابتدا ہوتی ہے ایک عہدی رشتے سے یعنی ایک مرد اور ایک عورت اپنے گھر کی نئی دنیا بسانے کا عہد کرتے ہیں اور اس عہد سے ایک نیا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ اس کے بعد اولاد پیدا ہوتی ہے اور یہ دونوں اپنی اولاد کو خود اپنی ذات کا جزو سمجھتے ہیں۔ اس طرح "گھر" ایک ایسی وحدت (*Unit*) بن جاتا ہے جس میں انفرادی مفاد، اجتماعی مفاد میں گم ہو جاتا ہے۔ اس سے اس فرد متعلقہ (باپ) کی نگاہوں میں اتنی کشاد اور قلب میں ایسی وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ ایک حد تک "بیرون خویش" مفاد کو بھی اپنی ذات کا مفاد سمجھنے لگ جاتا ہے۔ اس وسعت و کشائش سے انفرادیت کی بہت سی گرہیں کھل جاتی ہیں۔ تم ایسے افراد کی سیرت کا مطالعہ کرو جو تجرد کی زندگی بسر کرتے ہیں، یوگ اور سنیاس کے تجرد کی زندگی نہیں، بلکہ اس تجرد کی زندگی جس کے متعلق اکبر نے کہا ہے:

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

تم دیکھو گے کہ اس یکسر انفرادیت کی زندگی میں انسان کی سیرت کے بہت سے گوشے بحر بیکراں ہونے کی بجائے گھٹ گھٹ کر جوئے کم آب بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگ، کچھ مشینی قسم کے انسان بن جاتے ہیں۔ دلّی کی کرخنداری زبان میں یوں سمجھ لو کہ یہ "ایک دم لٹھ ہوتے

ہیں لٹھ" یعنی ان میں زندگی کی لوچ نہیں ہوتی۔

لیکن باپ اور اولاد کا یہ تعلق علم کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔ جس باپ کو معلوم نہ ہو کہ فلاں لڑکا اس کا بیٹا ہے وہ اسے کبھی اپنی ذات کا جزو نہیں سمجھتا۔ تم نے رستم و افراسیاب کا قصہ پڑھا ہوگا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہوگئے، اس لئے کہ انھیں معلوم نہ تھا کہ ان میں باپ اور بیٹے کا رشتہ ہے۔ لیکن جونہی ان پر یہ راز کھل گیا، دونوں اپنی اپنی جگہ پر رک گئے۔ لہٰذا اشتراکِ مفاد کیلئے اس امر کا ذہن نشین کرانا ضروری ہے کہ وہ افراد خود اس شخص کی ذات کا جزو ہیں۔ قرآن اس احساس کی بیداری (یا تعلیم) کی ابتدا، عائلی زندگی کی اہمیت کو سامنے لانے سے کرتا ہے۔ تم قرآن کے مختلف اوراق پر غور کرو اور دیکھو کہ عائلی زندگی (Family Life) کی ضرورت اور اہمیت کو کس طرح مختلف اسالیب اور متنوع انداز سے اجاگر کیا گیا ہے۔ اس سے مقصود اس حقیقت کو ابھار کر سامنے لانا ہے کہ ایک فرد کے مفاد اس کی اپنی ذات تک ہی محدود نہیں ہوتے بلکہ اس میں اور بھی شریک ہوتے ہیں۔ اس احساس سے انسان کی تربیتِ ذات کی ابتدا ہوتی ہے۔ عائلی زندگی کے اس نقطۂ آغاز سے قرآن بتدریج آگے بڑھتا ہے اور ان دیواروں کو ایک ایک کرکے توڑتا جاتا ہے جنھوں نے انسان کو محدود چار دیواری کے اندر محبوس کر رکھا ہے۔ جوں جوں یہ دیواریں ٹوٹتی ہیں اس کی افق نگاہ وسیع سے وسیع تر ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ آخر الامر اس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ وخلقناکم من نفس واحدۃ کہ تمام نوع انسانی کی تخلیقی اصل ایک ہے یعنی جس رشتہ (ایک اصل کی شاخیں ہونے کے احساس) نے باپ اور بیٹے میں اشتراکِ مفاد پیدا کر دیا تھا، قرآن اسی رشتہ کو تمام انسانوں میں مشترک قرار دیتا ہے اور اس طرح "عقل خود بیں" کو "عقل جہاں بیں"[1] میں تبدیل کر دیتا، اور نفس انسانی کی انفرادیت کی گرہیں کھول کھول کر اسے کُلیتِ انسانیہ کی وسعتیں عطا کر دیتا ہے۔ اس طریق کار کا نام ہے "تعلیم کتاب و حکمت" اور اس کا نتیجہ ہوتا ہے نفس انسانی کی نشوونما یعنی تزکیہ نفس (ویعلمھم الکتب والحکمۃ ویزکیھم)۔ اس طریق تعلیم (تصورِ ربوبیت کے عام کرنے) سے معاشرے میں ایسے افراد نکھر کر الگ ہو جاتے ہیں جن پر اس نظام کی اہمیت و اشگاف ہو جاتی ہے۔ ان افراد کے ہاتھوں اُس نظام کی ابتدا

---

[1] معلوم نہیں، سلیم، تم نے اقبال کا مطالعہ بالالتزام شروع کیا ہے یا نہیں۔ اگر اب تک نہیں کیا تو یقین مانو کہ تم نے زندگی کا اتنا قیمتی حصہ ضائع کر دیا۔ پیامِ مشرق میں دیکھو کہ وہ اہلِ فرنگ کو (جنھوں نے یکسر انفرادیت کی زندگی اختیار کر رکھی ہے اور رفتہ رفتہ عائلی زندگی تک کو بھی ترک کرتے جا رہے ہیں) مخاطب کرکے کیا کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

عقل خود بیں دگر و عقل جہاں بیں دگر است — بال بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است
اے خوش آں عقل کہ پیمائے دو عالم دارد — نور افروختہ و سوزِ دلِ آدم دارد

اور جاوید نامہ میں بتاتے ہیں کہ عقلِ خود بیں اور عقلِ جہاں بیں (وحی کی عطا فرمودہ بصیرت) میں فرق کیا ہے۔

عقل خود بیں غافل از بہبودِ غیر — سود خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ — در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

اسی کا نام کیرکٹر ہے۔

ہوتی ہے جس میں ہر فرد فکرِ احتیاج سے بے خوف ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ نظام قائم ہو جاتا ہے تو پورے معاشرے میں اُس کیرکٹر کی لہر دوڑ جاتی ہے جس کے فقدان کا رونا ہم آج اس طرح روتے ہیں۔ جب تک یہ نظام قائم رہتا ہے کیرکٹر بھی قائم رہتا ہے۔ جب یہ نظام بگڑ جاتا ہے تو پھر وہی انفرادیت کی بھاگڑ شروع ہو جاتی ہے۔ اس لئے سلیم، قوم میں کیرکٹر پیدا کرنے کے لئے اُس نظام کی ترویج ضروری ہے جس میں افراد فکرِ احتیاج سے بے نیاز ہو جائیں اور لاخوف علیھم ولاھم یحزنون کی فضا عام ہو جائے۔ ہم نے یہ نظام دیکھا نہیں، لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ یہ نظام حضور رسالتمآبؐ کے ہاتھوں متشکل ہوا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں پروان چڑھا۔ پھر یہ نظام باقی نہ رہا لیکن لوحِ زمانہ پر اس کی یادگار اب تک منقوش ہے۔ بقول غالبؔ

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے

اسی "پرتوِ نقشِ خیالِ یار" کے تصدق، ہر اس شخص کا، جس کی نگاہوں کے سامنے اس کا تصور ہو، یہ عالم ہوتا ہے کہ

موجِ گل سے چراغاں ہے گذرگاہِ خیال!

اسی نظامِ قرآنی کی طرف دعوتِ فکر میری زندگی کا مقصود ہے۔ میری کوششیں ابھی تک "تعلیم کتاب وحکمت" کی منزل اول میں ہیں۔ میں امکان بھر اس کے صحیح تصور کو عام کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ چونکہ عام مسلمانوں کی نگاہوں سے اس کا تصور یکسر اوجھل ہو چکا ہے، اس لئے اسے از سرِ نو سامنے لانے کے لئے بڑی کاوش درکار ہے۔ جب اس کا تصور عام ہو جائیگا تو پھر اسے عملاً متشکل کرنیکا ولولہ بھی بیدار ہوگا۔

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو! ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

تم پوچھتے ہو کہ اس تعلیم کتاب وحکمت کے مرحلہ اول کے بعد پھر کیا پروگرام ہوگا؟ تم نے جتنی مرتبہ اس سوال کو دہرایا ہے میں نے یہی کہا ہے کہ یہ سوال قبل از وقت ہے۔ پہلے اس تصور کو تو عام کرو۔ لیکن اس جواب سے تمہارے قلب سراپا شوق واضطراب کی تسکین نہیں ہوتی۔ اب اس کے بعد اگر میں تمہارے غالبؔ کے الفاظ میں یہ کہدوں کہ

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

تو کہو تمہاری تسکین ہو جائے گی!

تم ٹھیک کہتے ہو کہ

یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا

لیکن سلیم، ہر غنچہ اپنے جوشِ نمو سے کھل کر پھول بنتا ہے ـــ نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل ـــ اگر اس سے پہلے اسے کھلانے کی کوشش کرو تو اس کی ایک ایک پتی بکھر جائے گی۔ اس نظام کی شگفتگی بھی اُسی قانون کے تابع عمل میں آتی ہے جو اس کی اساس و بنیاد ہے۔ "انا علینا بیانہ" سے اسی قانونِ فطرت کی طرف اشارہ ہے۔ تمہیں اس نظام کے جلد رو بعمل آنے کی کوئی صورت بظاہر دکھائی نہیں دیتی لیکن

سلیم، میری نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے — جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

یہ کب ہوگا؟ اس کے لئے نہ تمہاری بیتابی تمنا کچھ کہہ سکتی ہے، نہ میرا گریۂ نیم شبی۔ اس باب میں تو خدا نے خود اپنے رسولؐ تک سے کہہ دیا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ انقلاب تمہارے بعد ظہور پذیر ہو یا خود تمہارے سامنے۔ فاما نذھبن بك فانا منھم منتقمون۔ او نرینك الذی وعدنٰھم فانا علیھم مقتدرون (۴۳/۴۱-۴۲)۔ لیکن یہ ہوگا کیسے؟ اس کے لئے نہایت حتم و یقین سے کہہ دیا کہ فاستمسك بالذی اوحی الیك انك علی صراط مستقیم (۴۳/۴۳)۔ تم قرآن کے ساتھ متمسک رہو۔ یہی وہ متوازن راہ ہے جو اس انقلاب تک لے جائے گی؟

یہی اس انقلابِ عظیم کے داعیِ اولؐ نے کیا۔ اور یہی تمہیں اور مجھے کرنا ہوگا۔

اس موضوع کو ختم کرنے سے پہلے ایک اہم نکتہ اور بھی ہے جس کا دہرا دینا ضروری ہے۔ تمہیں اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ انسانی زندگی کا منتہا اس کی طبعی زندگی کی ضروریات کا پورا ہو جانا ہی نہیں۔ ان ضروریات کی طرف سے اطمینان، اس کی نگاہوں میں وہ کشادگی پیدا کر دیتا ہے جس سے یہ ذاتی مفاد پر کلی مفاد کو ترجیح دیتا ہے، اور اس طرح انسانی معاشرہ میں ایک نظم، ضبط اور توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے وہ مساعد فضا پیدا ہو جاتی ہے جو انسان کی فطری صلاحیتوں کی بالیدگی کیلئے ناگزیر ہے۔ اس طرح بہ حیثیتِ مجموعی انسانیت کی سطح بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے۔ اس بلندیٔ سطح سے کیا ہوتا ہے؟ آج اس چیز کا سمجھنا دشوار ہے، اسلئے کہ آج ہم جس فضا میں سانس لے رہے ہیں اس میں نفسا نفسی کی ایسی بھگدڑ مچ رہی ہے کہ انسانی فکر کے لئے اس طلسم پیچ و تاب سے نکلنا محال ہو رہا ہے۔ اس وقت انفرادی مفاد کی دھند اس قدر گہری ہے کہ اس میں انسان دو قدم آگے نہیں دیکھ سکتا۔ ان حالات میں وہ کیا سمجھے کہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون کی فضا میں دلوں کی کیا کیفیت ہوا کرتی ہے۔ بقول اقبالؒ

بادمے نرسیدی خدا چہ می جوئی!

لیکن اسے بھی سمجھ رکھو کہ خدا تک پہنچنے کے لئے مقامِ آدم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور آدم وہ ہے جس کی مشہود زندگی کی ابتدا، اس ارض سے ہوتی ہے۔ لہٰذا جس آدم کے لئے ارض (معاش) کی مشکلات حل نہیں ہوتیں، اس کی نگاہیں اوپر کیا اٹھ سکیں گی۔

نہ تجھ پہ سہل ہوں جب تک زمیں کے ہنگامے — بری ہے مستیِ اندیشہ ہائے افلاکی

سلہ سلیم! جب ایک مرتبہ قائدِ اعظمؒ کے ساتھ دورانِ گفتگو میں، یہ آیت سامنے آگئی تو اس سے ان پر کیا کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اسے کسی دوسری فرصت میں بیان کروں گا۔ اس واقعہ کی یاد سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں۔ ان کی زندگی کے بعض لمحات ایسے بھی تھے جنہیں دیکھنے کی سعادت مجھے بھی نصیب ہوئی۔

اب سلیم، تمہارے اس سوال کا جواب سامنے آتا ہے کہ جب انسان نے اس دنیا میں ابھی کروڑوں سال تک اور رہنا ہے تو نبوت کا سلسلہ کیوں ختم ہو گیا۔ ختم نبوت کی حقیقت، علم اور مصلحت کے متعلق "معراج انسانیت" کے آخری باب میں تفصیل کے ساتھ لکھا جا چکا ہے۔ اسے نہایت غور سے پڑھو، بات واضح ہو جائے گی۔ سلسلہ رشد و ہدایت سے مقصود یہ تھا کہ انسانی معاشرہ میں ایسے انقلابات آتے رہیں جن سے اس میں نظم و توازن پیدا ہوتا رہے اور اس طرح انسانیت بتدریج اپنی ارتقائی منازل طے کرتی جائے۔ انسانی شعور کی ابتدائی زندگی میں یہ انقلابات اشخاص کے ذریعے رونما ہوتے تھے۔ انسانی تاریخ پر غور کرو۔ اس میں یہاں، وہاں ایسے اشخاص کھڑے دکھائی دیں گے جو عام سطح سے اونچے ہوں گے۔ عام سطح کے نقوش، انسانی تاریخ کی الواح پر باقی نہیں رہے (نہ وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ باقی رہیں) لیکن ان ابھرے ہوئے انسانوں کی یاد تاریخی فضا میں ابھی تک باقی ہے۔ یہی وہ افراد تھے جن کے ہاتھوں کسی نہ کسی طرح کا انقلاب واقع ہوا۔ انقلاب انگیزی کا یہ طریق (Process) انسانی شعور کے ابتدائی مراحل کی چیز تھی۔ جب انسانی شعور آگے بڑھا تو فطرت نے خود اس طریق کو ترک کر دیا اور اس کی جگہ وہ طریق اختیار کیا جس سے خارجی دنیا میں انقلاب لانے کیلئے انسان کی ذہنی دنیا میں تبدیلی پیدا کی جاتی ہے۔ یہ ذہنی تبدیلی تصورات کے بدلنے سے ہوتی ہے۔ لہٰذا اب انقلابی دنیا میں افراد کی جگہ تصورات نے لے لی۔ تم غور کرو سلیم، آج دنیا میں افراد کے درمیان جنگ نہیں ہو رہی، مختلف تصورات (Ideologies) کی جنگ ہو رہی ہے۔ اب امامت (Leadership)، اشخاص (Personalities) کی نہیں، بلکہ تصورات (Ideologies) کی ہے۔ اب مقابلہ مختلف افراد کا نہیں، مختلف نظامہائے زندگی کا ہے اور نظام کی بنیاد اشخاص پر نہیں بلکہ تصورات پر ہوتی ہے۔

رسول کی ذات میں شخصیت اور تصوریت (Personality and Ideology) دونوں یکجا ممزوج (ملی ہوئی) ہوتی ہیں۔ یوں سمجھو کہ نبوت، شخصیت کی مظہر ہوتی ہے اور رسالت، آئیڈیالوجی کی نقیب۔ نبی اکرمؐ کے بعد نبوت (شخصیت) ختم ہو گئی اور رسالت (آئیڈیالوجی) باقی رہ گئی۔ اسلئے کہ اب انقلابات کا مدار رسالت (Ideology) پر تھا نہ کہ شخصیتوں پر۔ آئیڈیالوجی حروف و نقوش کی شکل میں محض مجرد تصور (Abstract Concept) ہوتی ہے۔ اس کی عملی صورت نظام کہلاتی ہے۔ لہٰذا یوں کہہ لو کہ ختم نبوت کے بعد اشخاص کی جگہ نظام نے لے لی۔ اب دنیا میں افراد کی اہمیت نہیں رہی، اہمیت نظام کی ہو گئی۔ جو نظام بہتر ہو گا امامت اسی کے حصہ میں آئے گی۔ نبوت ختم ہو گئی لیکن رسالتِ محمدیہ (قرآن کی شکل میں) قیامت تک کیلئے باقی ہے۔ اس سے مفہوم یہ ہے کہ جو نظام اس رسالت (آئیڈیالوجی) کی رو سے قائم ہو گا دنیا کی امامت اسی کے ہاتھ میں ہو گی۔ باقی دنیا رفتہ رفتہ اس حقیقت کے قریب آ رہی ہے کہ اب امامت اشخاص کی نہیں، تصورات کی ہے اور مقابلہ افراد کا نہیں بلکہ نظامہائے زندگی کا ہے۔ لیکن مسلمان اس حقیقت سے دور ہی نہیں بلکہ اس راہ میں روک بن کر کھڑا ہے۔ ختم نبوت کی یہ غلط مدت ہوئی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہے۔ اس لئے اس نے اس رسالت (پیامِ خداوندی) کو ایک عرصہ سے پس پشت ڈال رکھا ہے جس کی رو سے قائم کردہ نظام نے اسے امامتِ اقوام عطا کرنی تھی، اس کی جگہ یہ قرنہا قرن سے

شخصیت پرستی کی جھاڑیوں میں الجھ رہا ہے۔ سلاطین، آئمہ، فقہا، رواۃ، علماء، مشائخ، زندہ اور مردہ مقربین بارگاہ خداوندی، غرضیکہ یہاں سے وہاں تک اس کی راہ میں اشخاص ہی اشخاص دکھائی دیتے ہیں۔ تصورات (آئیڈیالوجی) کا کہیں ذکر تک نہیں۔ یہ حقیقت اس کی سمجھ میں ہی نہیں آسکی کہ اگر فطرت کے پروگرام میں یہی ہوتا کہ انسانی معاشرہ میں انقلاب اشخاص ہی کا محتاج رہے گا تو انبیاء کا سلسلہ بدستور جاری رہتا۔ مشیتِ خداوندی نے افراد کی جگہ آئیڈیالوجی کو دیدی۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک خدا کا یہ فیصلہ (معاذاللہ) ٹھیک نہ تھا انھوں نے ختم نبوت کے باوجود اشخاص کا سلسلہ جاری رکھا۔ پہلے علماء کو "کانبیاء بنی اسرائیل" بنا کر اُس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی، جو ان کے ذہن میں ختمِ نبوت کی رو سے پیدا ہو رہی تھی۔ اس سے بھی کام نہ چلا تو ہر صدی پر ایک مجدد کو بلایا گیا کہ خدائی پروگرام کے اس نقص کو وہی آکر پورا کرے۔ اس سے بھی ہوسِ اشخاص پرستی کی تسکین نہ ہوئی تو ایک آخری نجات دہندہ (مہدی آخرالزماں) کا انتظار کرنے لگے۔ تم نے غور کیا، سلیم، کہ مسلمان نے کس طرح ختم نبوت کی حقیقت سے عملاً انکار کیا ہے۔ جب انھوں نے اس طرح رسالت (آئیڈیالوجی) کی جگہ اشخاص کی طلب شروع کردی تو گاہک شناس دکاندار طلب و رسد (Supply and Demand) کے اصول کے مطابق اس جنس کو منڈی میں لے آئے جس کی تلاش ان گاہکوں کو دکان دکان لئے پھرتی تھی۔ انھوں نے کہا کہ تم انبیاء کی کمی محسوس کر رہے ہو اور اس لئے علماء، محدث، مشائخ، مجدد، مہدی کے ناموں سے اپنا جی بہلاتے ہو! لیکن ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے ہاں چلتا پھرتا "نبی" موجود ہیں، انھیں لو اور اس خلا کو پورا کرلو جو تمہارے ذہن میں ختم نبوت کی رو سے پیدا ہوگیا ہے۔ غور کرو، سلیم، قلب و نظر کی یہ تمام پریشانیاں اور متاعِ دین و دانش کی یہ تمام رہزنیاں اور قرآنیاں اسی ایک علت کی معلول ہیں کہ مسلمانوں نے ختم نبوت کے عقیدے کے باوجود اشخاص کے بجائے آئیڈیالوجی (رسالت) کو درخورِ امامت نہیں سمجھا۔

یاد رکھو، سلیم، اشخاص کی امامت کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اب آئیڈیالوجی اور نظام کی امامت کا دور ہے، اور یہی مفہوم ہے ختم نبوت کا۔

اچھا سلیم! تمہاری دو تین باتیں اور جواب طلب ہیں۔ لیکن ان کے جواب سے پہلے میں تمہاری توجہ پھر اُس اہم نکتہ کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں جسے ـــــ بارہا گفتہ ام و بار دگر می گویم ـــــ اور وہ یہ کہ جو بات تم پوچھتے ہو پہلے اس کا مفہوم متعین کرو۔ یاد رکھو سلیم! آدھی بات تو محض تعینِ مفہوم سے واضح ہو جائیگی۔ یقین نہ آئے تو ایسا کرکے دیکھ لو! میں کہتا ہوں سلیم! اگر ہم اس دور میں صرف اتنا کرجائیں کہ ہمارے ہاں جو الفاظ اور اصطلاحات مروج ہیں ان کا مفہوم اس طرح متعین کرلیں کہ ہر بولنے اور سننے والے کے ذہن میں ایک ہی مفہوم آئے (جس طرح پانی کہنے سے ہر شخص کے ذہن میں ایک ہی مفہوم آتا ہے) تو یقین مانو کہ یہ بہت بڑا کام ہوگا۔ میں اسی کی کوشش کر رہا ہوں۔ خدا مجھے کامیاب کردے۔ ذرا سوچو سلیم! کہ جب تم سے کوئی کہے کہ فلاں کاروبار کرو، اس میں تمہیں نفع ہوگا، تو کہنے والا بھی سمجھتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور تم بھی جانتے ہو کہ اس سے مطلب کیا ہے۔ یہ الفاظ ایک ہندو کہے یا مسلمان، سنی کہے یا شیعہ، مقلد کہے یا غیر مقلد، ہر ایک کا مفہوم ایک ہوگا۔ لیکن سلیم! جب کبھی تم سے کوئی یہ کہتا ہے کہ فلاں کام کرو، اس سے تمہیں ثواب ہوگا تو ایمان سے کہو، تمہاری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ اس سے کیا ہوگا؟

یا یہ کہ ان الفاظ کا جو مفہوم تم نے سمجھا ہے، تمہیں یقین ہے کہ کہنے والے کے ذہن میں بھی وہی مفہوم ہے؟ پھر یہ بھی سوچو کہ کیا تم کسی ایسے شخص کو جو اس لفظ (ثواب) کے اس مفہوم سے واقف نہیں جو وراثتی طور پر ہمارے ذہنوں میں چلا آرہا ہے، سمجھا سکتے ہو کہ اس سے مفہوم کیا ہے؟ جب کوئی زیادہ اصرار کریگا تو تم کہدو گے کہ اس سے "نجات" حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے پھر وہی مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ "نجات" سے مفہوم کیا ہے؟ اور کیا یہ مفہوم ہر اس شخص کے ذہن میں یکساں ہوتا ہے جو اس لفظ کو استعمال کرتا ہے! تم کہدو گے کہ اس سے مفہوم جنت میں جانا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا جنت کا مفہوم تمہارے ذہن میں متعین ہے؟ اور کیا یہی مفہوم ہر اس شخص کے ذہن میں ہوتا ہے جو اس لفظ کو استعمال کرتا ہے؟ مجھے تسلیم ہے کہ جہانتک ان امور کا تعلق آنے والی زندگی سے ہے، ان کا پورا پورا مفہوم زندگی کی موجودہ سطح پر سمجھ میں نہیں آسکتا لیکن ان امور کا تعلق صرف آنیوالی زندگی ہی سے تو نہیں۔ ہماری موجودہ زندگی سے بھی تو ان کا تعلق ہے۔ سوال یہ ہے کہ جہانتک ان کا تعلق ہماری موجودہ زندگی سے ہے، کیا ان کا کوئی متعین مفہوم ہمارے سامنے ہے؟ اور کیا وہ مفہوم ہر اُس شخص کے ذہن میں یکساں ہے جو ان اصطلاحات کو استعمال کرتا ہے؟ یہ تو تمہیں بھی تسلیم ہوگا کہ ایسا نہیں ہے۔ ان کا کوئی متعین مفہوم ہمارے سامنے نہیں۔ ان اصطلاحات کو سلیم! قرآن نے پیش کیا ہے۔ لہٰذا قرآن کو ان کا مفہوم بھی متعین کرنا چاہیئے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو (معاذ اللہ) وہ بڑی ناقص کتاب ہے۔ لیکن اگر وہ ان کا مفہوم متعین کرتا ہے تو وہ آج ہماری نگاہوں سے یکسر اوجھل ہے۔ یاد رکھو! سلیم! جب تک ہم ان الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم جن کا تعلق ہماری موجودہ زندگی سے ہے (اور وہ کونسی چیز ہے جس کا کسی نہ کسی حد تک ہماری موجودہ زندگی سے تعلق نہیں) اسطرح متعین نہیں کرتے جس طرح ہم کاروباری دنیا میں الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم متعین کرتے ہیں، ہمارا کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ کاروباری دنیا میں تجریدی گفتگو (Abstract Talk) سے کبھی کام نہیں چل سکتا۔ نہ کوئی قوم اس انداز گفتگو سے زندہ رہ سکتی ہے۔ ہمیں ٹھوس (Concrete) زمین پر رہنے کیلئے بھیجا گیا ہے۔ ہمارے معاملات بھی ٹھوس (Concrete) انداز گفتگو سے طے ہونے چاہئیں۔ دیکھتے ہو کہ غالبؔ اپنی رندانہ شوخی سے اس باب میں کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں   بوسے کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ یوں

لہٰذا سلیم! سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم ان تمام الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم جنہیں روزمرہ بلا سوچے سمجھے استعمال کرنے کے عادی ہو چکے ہیں، قرآن سے متعین کرلیں۔ اس کے بعد باقی منزل بہت آسانی سے طے ہو جائیگی۔ تم بھی جب کوئی بات پوچھو تو پہلے اس کا مفہوم متعین کر لیا کرو۔

مجھے اس سے خوشی ہوئی، سلیم، کہ میرے خطوط سے تمہارے شکوک کی بہت سی پھانسیں نکلتی جارہی ہیں؛

دعا دینگے میرے بعد آنیوالے میری وحشت کو   بہت کانٹے نکل آئے ہیں میرے ساتھ منزل کے

لیکن اس میں میری کاریگری تو کچھ نہیں، یہ تو اس کتاب مبین کا تصدق ہے جس کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ لاریب فیہ۔ اس سے قلب کے تمام اضطراب رفع ہو جاتے ہیں۔[1]

نہیں اس میں شک کوئی تاجور کہ تڑپ ہی تیرے کلام میں   مگر اس میں تیرا کمال کیا غم دوست درد نگار ہے

یہ خط توقع سے زیادہ لمبا ہو گیا۔ باقی باتوں کے متعلق پھر سہی۔

والسلام

پرویز

---

[1] ریب کے معنی اضطراب قلب کے ہیں۔

اقبال کا تصورِ علم

(ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب)

[پاکستان کی یہ دوگونہ خوش بختی ہے کہ ایک طرف اس کی سرزمین فطرت کی لاانتہا بخشائشوں سے بہرہ یاب ہے اور دوسری طرف یہ خطہ بیرونِ ملک کے اربابِ علم و ذوق کے لئے وجۂ کشش بن رہا ہے۔

تو نخلِ خوش ثمرے کیستی کہ سرو و سمن ہمہ ز خویش برید ند و با تو پیوستند

ہمارے محترم ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب اس حقیقت کی تابندہ شہادت ہیں۔ آپ عثمانیہ یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ، اہل و عیال، اعزہ و اقارب، مال و منال، کتب خانہ، مسودات وغیرہ سب کچھ حیدر آباد میں چھوڑ کر، پاکستان کی محبت میں دیوانہ وار چل دیئے اور تین کپڑوں میں شاداں و فرحاں یہ کہتے ہوئے یہاں پہنچ گئے کہ

بے دست و پائیم کہ ہنوز از وفورِ عشق سودا ست در سرم کہ بہ ساماں برابر است

یہاں پہنچنے پر اہلِ پاکستان نے اس گنجینۂ علم و کمال کا کس طرح استقبال کیا، یہ ایک حقیقت ہے بڑی جگر خراش اور ایک حدیث ہے بڑی الم انگیز کہ جس کی یاد سے ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ لیکن دیارِ محبت کے انداز بالکل نرالے ہیں کششِ عشق، ایجاب و استقبال سے بے نیاز اور اعتنا و استمزاج سے مستغنی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس بے رخی اور بے اعتنائی سے محترم صدیقی صاحب کے نزدیک پاکستان کی محبوبیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس قسم کی کشادہ نگہی ایک بلند سیرت ہی کا پرتو ہو سکتی ہے۔

ہم محترم صدیقی صاحب کے بنہایت شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود طلوع اسلام کو اپنے حسنِ خیالات سے نوازا۔ علامہ اقبال ـــ عشق با زیرکی آمیزدہ ـــ کے جس پیغام کو عام کرنا چاہتے تھے صدیقی صاحب اس کی درخشندہ مثال ہیں۔ زیرکی کا یہ عالم کہ ان کے نظریاتِ ریاضی، حکیم آئن سٹائن اور ہائزن برگ تک سے دادِ تحسین حاصل کرنے کے اہل ہوئے ہیں۔ اور عشق و جنون کی یہ کیفیت کہ اتنے بڑے ریاضی دان کا قلب صہبائے اقبال و قرآن سے لبریز ہے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

سرزمینِ پاکستان محترم صدیقی صاحب جیسی متاعِ گراں بہا پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے۔ طلوع اسلام]

علامہ اقبال کے کلام کے سرسری مطالعہ سے بعض لوگوں کو یہ خیال ہوگیا ہے کہ علامہ مرحوم فکری علوم کے قطعی مخالف تھے اور ان کی نظر میں ان علوم کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ اقبال کے چند اشعار سے بادی النظر میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایسا خیال ایک حد تک درست ہے لیکن اگر ان کے کلام اور خصوصاً لکچروں کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ خیال قطعاً غلط ہے اور اقبال اسلام کی مسلّمہ تعلیم کے خلاف کوئی آواز کبھی نہیں نکال سکتے تھے۔ علم کی جو قدر و منزلت قرآن میں بیان کی گئی ہے اور نبی کریمؐ نے علم کی اہمیت کو جس طرح واضح فرمایا ہے اس سے واقف ہونے کے بعد ناممکن تھا کہ اقبال جیسا مرد مومن علم کی تحقیر کرتا۔ قرآن مجید میں بلند مدارج تک پہنچنے کے لئے ایمان اور علم دونوں کو ضروری قرار دیا گیا ہے:

یرفع اللہ الذین امنوا والذین اوتوا العلم درجات

اسی طرح قرآن کی دوسری متعدد آیتیں ہیں جن میں علم کی اہمیت جتلائی گئی ہے اور انسانوں کو غور و فکر کی ہدایت کی گئی ہے رسول اکرمؐ کی دعا بھی اکثر یہی تھی کہ ان کے علم میں زیادتی ہو۔

سید کل صاحب ام الکتاب — پردگی ہا بر ضمیرش بے حجاب
گرچہ عین ذات را بے پردہ دید — رب زدنی از زبان او چکید

اس سے ظاہر ہے کہ اقبال علم کی اہمیت سے ناواقف نہیں تھے۔ کیونکہ علم رفع درجات کا ایک جزو لاینفک ہے اور انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی توجیہہ اسی بنا پر کی گئی ہے کہ "وعلم آدم الاسماء کلہا"۔ اقبال نے جس چیز پر زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ علم محض ایک جزو ہے اور وہ بھی جزو ثانی۔ اگر عالم کے دل میں ایمان یا عشق کا جذبہ نہ ہو تو اس کا علم بجائے مفید ہونے کے مضر ہوتا ہے جیسا کہ مولانائے روم نے فرمایا ہے:

علم را بر تن زنی مارے بود

یا جیسا خود اقبال کہتے ہیں:

علم بے روح القدس افسوں گری است

یہ حقیقت اس زمانے میں کافی آشکارا ہو گئی ہے کہ جن انسانوں میں جذبۂ ایمان مفقود ہے وہ علم کی ترقی سے نوع انسان کی فلاح و بہبود کی بجائے تباہی و بربادی کا سامان کر رہے ہیں۔ اسی لئے اقبال زور دیتے ہیں کہ علم کو ایمان کے تابع ہونا چاہئے اور اسی طرح ایمان بھی بغیر علم کے مستحکم نہیں ہو سکتا۔

زیرکی از عشق گردد حق شناس — کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہمبر شود — نقشبند عالم دیگر شود

خیز و نقش عالم دیگر بنہ عشق را با زیرکی آمیز دہ

اقبال کے نزدیک علم کی اہمیت اس حد تک تھی کہ وہ اس کو ایک قسم کی عبادت سمجھتے تھے۔ اس میں 'مشرقی' اور 'مغربی' علم کا کوئی امتیاز نہیں، سب علم مومن کی گم شدہ میراث ہے اور حدیث شریف "العلم سلاحی" (علم میرا ہتھیار ہے) کی بموجب تسخیر فطرت کا ذریعہ:

گفت حکمت را خدا خیر کثیر ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر
علم اشیا اعتبار آدم است حکمت اشیا حصار آدم است
علم اشیا داد مغرب را فروغ حکمت او ماست می بندد ز دوغ
زندگی جہد است و استحقاق نیست جز بہ علم انفس و آفاق نیست

علم اشیا علم الاسماستے
ہم عصا و ہم ید بیضاستے

۲۔ اپنے منظوم کلام میں عقل و عشق، نظر اور خبر وغیرہ کی طرف اقبال نے جستہ جستہ اشارہ کیا ہے لیکن 'خطبات' میں باضابطہ فلسفیانہ طور پر علم، وجدان، واردات، اور داخلی محسوسات کی ماہیت سے بحث کی ہے جس کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ خارجی کائنات کے علم کی ان کی نظر میں کس قدر اہمیت تھی۔ اس مضمون میں اقبال کے ان خیالات پر اور جدید سائنسی افکار میں علم کی ماہیت کے ساتھ اس کے تعلق پر مختصر بحث کی جائے گی۔

اقبال کے نزدیک فکر اور وجدان میں کوئی اندرونی تضاد نہیں ہے۔ دونوں کی اصل ایک ہی ہے اور دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ فکر حقیقت کو تدریجی طور پر اور اجزا میں تحلیل کر کے بے نقاب کرتی ہے اور وجدان سے حقیقتِ آنِ واحد میں کلی طور پر پیش نظر ہو جاتی ہے۔

اس بیان میں اقبال نے غور و فکر کے ذریعہ کائنات کا علم حاصل کرنے کے دو اہم نکتے پیش کئے ہیں۔ ایک تقارب (Approximation) اور دوسرا تحلیل (Analysis) کسی شے کا ٹھیک علم حاصل کرنے کیلئے اتنے اجزا سے واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی سائنس داں ان سب کو بوقت واحد معلوم کرنے کی امید نہیں کر سکتا اور بالفرض اگر یہ تمام اجزا معلوم بھی ہوں تو ان سب کا ایک ساتھ استعمال اس قدر پیچیدہ اور ناقابل عمل ہو جاتا ہے کہ ان مسائل کو مکمل طور پر حل کرنا بڑے سے بڑے ماہرین کے بس سے بھی باہر ہوتا ہے۔ اس لئے کوشش یہ کی جاتی ہے کہ مختلف اجزاء کو علیحدہ کیا جائے اور ہر جزو کا جو اثر مسئلہ زیر بحث پر پڑتا ہے اس سے فرداً فرداً بحث کی جائے تاکہ بالآخر تمام اجزا کا مجموعی اثر نتیجہ کے طور پر حاصل ہو سکے۔ مثلاً سیاروں کی

حرکت پر غور کیجئے۔ پہلے صرف سورج کی قوت تجاذب کا جو اثر سیارہ پر ہوتا ہے اس کو پیش نظر رکھ کر سیارہ کا راستہ یا مقام اور رفتار معلوم کی جاتی ہے۔ پھر یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک دوسرے سیارہ کی موجودگی سے اس نتیجہ میں کیا تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔ اس کے بعد تیسرے سیارے کا اثر محسوب کیا جاتا ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ غرضکہ تدریجی طور پر یکے بعد دیگرے تمام اثرات کو شمار کیا جاتا ہے۔ اور یہ جدید سائنس کا ایک بنیادی اصول ہے جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے۔

اس کے برخلاف وجدان کو حقیقت تک پہنچنے کے لئے اس تقارب اور تحلیل کی ضرورت نہیں ہوتی وہ ایک لمح بصر میں پوری حقیقت کا بغیر تجزیہ کے مشاہدہ کرتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی شے کے رنگ پر غور کیجئے۔ ہم جانتے ہیں کہ رنگ اس شے سے منعکس ہونے والی روشنی کے طول موج پر منحصر ہوتا ہے اور کسی منور شے سے جو روشنی خارج ہوتی ہے اس کا تعدد یا موجوں کی تعداد لاکھوں کروڑوں تک پہنچتی ہے یعنی فکر محض کے ذریعہ اس رنگ کی شناخت کے لئے ان تمام موجوں کا حساب لگانا پڑتا ہے۔ لیکن نظر ایک لمحہ میں اس رنگ کو اخذ کر لیتی ہے۔ اعلیٰ تر حقیقتوں کے لئے یہی فرق فکر اور وجدان کا ہے اور اقبال نے اسی فرق کی طرف اشارہ کیا ہے جب وہ فرماتے ہیں:-

علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے ام الکتاب

اس کے باوجود اقبال کا ایقان ہے کہ فکر اور وجدان دونوں ایک دوسرے سے تقویت حاصل کرتے ہیں اور دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دونوں اسی ایک حقیقت کی تلاش میں ہیں اور اپنے اپنے دائرۂ عمل کے لحاظ سے حقیقت کو منکشف کرتے ہیں۔

۳۔ آگے چل کر اقبال اس نکتہ پر بحث کرتے ہیں کہ فکر کا دائرۂ عمل محدود ہے یا لامحدود۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ وجدان حقیقت کے دائمی پہلو پر اور فکر اس کے زمانی پہلو پر نظر رکھتی ہے لیکن اسی کے ساتھ وہ بتاتے ہیں کہ فکر اور وجدان عضوی طور پر ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ چونکہ فکر کا تعلق تسلسل زمان سے ہے اسلئے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فکر میں ایک طرح کی تحدید اور عدم تکمیل ہے۔ لیکن یہ خیال کہ فکر لازماً محدود ہے اور لامحدود کا تصور کرنے سے قاصر ہے غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ممکن ہے محض منطقی استدلال کی بنا پر جو علم حاصل ہوتا ہے وہ غیر تشفی بخش ہو کیونکہ ایسے علم کی بنا پر شاید باہم مختلف اجزا میں کوئی تعلق یا وحدت ثابت نہ ہو سکے۔ منطقی علم کا واحد طریقہ یہی ہے کہ مشابہتوں کی بنا پر خاص سے عام کی طرف جائے اور عام نتیجہ حاصل کرے۔ اس کو نظریہ علم میں "استقرائی طریقہ" کہتے ہیں۔ سائنس میں استقرائی طریقہ ایک عرصہ دراز سے رائج ہے۔ اس میں ایک واقعہ کی اہمیت اسی حد تک ہے کہ اس سے ایک عام قانون یا اصول کے وضع کرنے میں مدد ملے۔ سائنس میں ابتدا اگرچہ ایک خاص واقعہ سے ہوتی ہے لیکن وہ اس خاص واقعہ تک محدود نہیں ہوتی۔ اس میں ایک واقعہ محض ایک انفرادی واقعہ نہیں رہتا بلکہ وہ

ایک عام اصول تک جانے والے سلسلہ کی ایک کڑی ہوتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں سے سائنسداں اور حسن کار کے راستے جدا ہو جاتے ہیں۔ حسن کار کسی واقعہ کی ایک معین خصوصیت ہی کے اظہار پر اپنا سارا کمال صرف کر دیتا ہے، اس کو اس واقعہ کے تمثیلی پہلو سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اور نہ وہ عام اصول وضع کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک مثال کے ذریعہ استقرائی طریقہ کی وضاحت کی جائے۔ ہمیں معلوم ہے کہ گیلیلیو نے سطح زمین کے قریب گرنے والے اجسام کا قانون دریافت کیا تھا۔ یہ قانون چند اجسام کو گرتے ہوئے دیکھکر بنایا گیا تھا۔ تقریباً اسی زمانہ میں کپلر نے سیاروں کی حرکت کا مشاہدہ کیا اور ان کی حرکت کے متعلق تین قانون بنائے۔ نیوٹن نے گیلیلیو اور کپلر کے نتیجوں کی مدد سے استقرائی طور پر ایک عام قانون تجاذب اخذ کیا جو نہ صرف گرنے والے اجسام اور سیاروں کی حرکت کے قوانین پر بلکہ مدوجزر اور مدار ستاروں کی حرکت وغیرہ کے قوانین پر بھی حاوی تھا اور اس طرح ایک زیادہ عام استقرائی اصول تھا۔ پندرہ بیس سال قبل تک تمام علوم فطرت میں عام اصول اور قوانین اخذ کرنے کا یہی ایک استقرائی طریقہ رائج تھا۔ لیکن اب آئن شائن کے نظریۂ اضافیت اور ہائی زن برگ کے کوانٹم نظریہ کی بدولت قوانین اور اصول اخذ کرنے کا ایک دوسرا اور بہتر طریقہ معلوم ہوا ہے جس کی تشریح ایک مثال کے ذریعہ سے کی جا سکتی ہے:-

فرض کیجئے کہ ایک ماہر سائنس علمی اغراض کے لئے دریا میں جال ڈال کر مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ اس کا جال ایسا ہے جس کے سوراخوں کا طول اور عرض ایک انچ ہے۔ ایک عرصہ تک اس طرح مچھلیاں پکڑنے کے بعد سائنس داں ان کا بغور مشاہدہ کرتا ہے اور اس مشاہدہ کے نتیجوں کو عام کر کے دو قانون اخذ کرتا ہے:-

(۱) دریا میں کوئی مچھلی ایک انچ طول سے کم نہیں ہے۔

(۲) دریا کی ہر مچھلی کا گلپھڑا ہوتا ہے۔

یہ دونوں قانون سائنس داں نے مشاہدہ کی بنا پر استقرائی طریقہ سے اخذ کئے ہیں۔ لیکن ایک سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص فوراً یہ کہہ سکتا ہے کہ پہلا قانون اخذ کرنے کے لئے اس تمام دردسر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ محض جال کی ساخت پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس جال سے جو مچھلیاں پکڑی جائیں گی وہ کبھی ایک انچ طول سے کم نہیں ہوں گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم کائنات کا علم حاصل کرنے کے طریقوں پر غور و فکر کریں تو خود اس غور و فکر سے بھی ہمیں کائنات کے بنیادی قوانین کا علم حاصل ہو سکتا ہے جن میں تجربوں یا مشاہدوں کی بنا پر تبدیلی کا امکان نہیں ہے کیونکہ یہ ان سے آزاد ہوتے ہیں۔ قوانین حاصل کرنے کے اس طریقہ کو "علیاتی طریقہ" (Empistemoligical Method) کہتے ہیں اور علیاتی قوانین استقرائی قوانین کی طرح تبدیل پذیر نہیں ہوتے۔ اس سے اقبال کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ غور و فکر کے ذریعہ کسی آخری نتیجہ تک پہنچنا ممکن ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اپنی گہری حرکت میں فکر اس قابل ہے کہ لامحدود تک پہنچ سکے۔ لامحدود کی خود منکشف حرکت میں محدود تصورات محض مختلف مقامات ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فکر اپنی اصلیت میں ساکن و جامد نہیں بلکہ متحرک ہے اور زمان میں اپنی ذاتی لامحدودیت کا انکشاف اسی طرح کرتی ہے جس طرح ایک دانۂ تخم جو ابتدا ہی سے اپنے اندر پورے درخت کی مکمل وحدت کو مضمر کئے ہوئے ہوتا ہے۔ گویا فکر اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک کل ہے جس کے عمل کو ہم تسلسلی زماں میں جزناً جزناً ملاحظہ کرتے ہیں۔ ان اجزا کی اہمیت ہی یہ ہے کہ وہ ایک کل کے حصے ہیں۔ اس 'کل' کو قرآن کریم نے استعارتاً 'لوح محفوظ' کہا ہے جو علم کے تمام غیر متعین امکانات پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ امکانات تسلسلی زماں میں بتدریج ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ علم کی تشکیل میں یہ کامل لامحدود کا وجود ہی ہے جو محدود فکر کو ممکن بناتا ہے۔ جرمن فلسفی کانٹ نے فکر کو محدود تسلیم کرنے میں بڑی غلطی کی ہے۔ اس نے اس حقیقت کو پیش نظر نہیں رکھا کہ فکر تحصیل علم کے فعل کے ساتھ ہی اپنی محدودیت سے آگے نکل جاتی ہے طبیعی کائنات کی محدودیت اور فکر کی محدودیت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں طبیعی کائنات کی ہر شے ایک دوسرے سے علیحدہ اور محدود ہے لیکن فکر کی حدود اس طرح ایک دوسرے سے خارج نہیں ہیں کیونکہ اس کائنات کی ہر شے فکر کے دائرۂ عمل میں شامل ہے۔

۴۔ اقبال نے اپنے خطبات میں تفصیل کے ساتھ اس امر سے بحث کی ہے کہ اسلام نے فکر محض کے علاوہ علم کے اور دوسرے ذرائع کا انکشاف کیا۔ ان میں 'استقرائی ذہن' (تاریخ) اور مطالعۂ فطرت (مشاہدہ اور تجربہ) شامل ہیں۔ قرآن میں انفس (ذات) اور 'آفاق' دونوں کو علم کا ذریعہ بتایا گیا ہے اور خداوند کریم اپنی نشانیوں کو داخلی اور خارجی دونوں قسم کے تجربوں میں پیش کرتا ہے۔ قدیم یونانی فلسفیوں نے مشاہدے اور تجربے سے قطع نظر محض فکر پر زور دیا تھا۔ اقلیدسی طریقہ کی کامیابی سے وہ اس قدر مرعوب ہوئے کہ انھوں نے سمجھا حقیقی علم صرف خیال اور فکر سے حاصل ہو سکتا ہے۔ بعض تو اس انتہا تک پہنچ گئے تھے کہ اگر کوئی قدرتی مظہر فلسفیوں کے قول کے مطابق وقوع پذیر نہیں ہوتا تو یہ اس قدرتی مظہر کا نقص ہے۔ قدرت غلطی کر سکتی ہے مگر فلسفی غلطی نہیں کر سکتا۔ یونانیوں کے برخلاف اسلام نے علم حاصل کرنے کیلئے محسوس اور محدود اشیاء کو پیش نظر رکھا اور ان کے مشاہدہ کرنے کی اہمیت جتلائی۔ آیۃ شریفہ وعلم الآدم اسماء کلھا سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اشیاء کی شناخت کی طاقت عطا کی گئی ہے اور اشیاء کی ماہیت کا علم ان کے مسخر کرنے کے مترادف ہے۔ گویا علم کی نوعیت تصوری ہے اور اس تصوری علم کی مدد سے انسان حقیقت کے مشاہدہ پذیر پہلوؤں کا انکشاف کرتا ہے۔ قرآن میں حقیقت کے مشاہدہ پذیر حیثیت پر کافی زور دیا گیا ہے اور متعدد آیتوں میں ہدایت کی گئی ہے کہ زمین اور آسمان اور ان کے درمیانی مظاہرہ کا مشاہدہ کیا جائے اور ان پر تفکر اور تدبر کیا جائے۔

ان فی خلق السموات والارض ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ (۲/۱۵۹)

طبیعی سائنس کے جدید ترین نظریے یعنی اضافیت اور کوانٹم نظریے بھی اب اس مشاہدہ پذیری پر بہت زور دیتے ہیں۔ ان نظریوں کا

بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ سائنس میں غیر ضروری تصورات داخل نہیں کرنے چاہئیں اور خصوصاً جو چیز کسی سائنسی تجربے یا مشاہدے میں محسوس نہ ہو اس کو شامل ہی نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس کو شامل کرنے سے نہ صرف یہ کہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں بلکہ غلط نتیجے بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اس بیسویں صدی میں طبیعی سائنس کی جو غیر معمولی ترقی ہوئی ہے اور جس کا ایک کرشمہ ایٹم بم ہے وہ بڑی حد تک اسی بنا پر ہے کہ طبیعیات میں سے غیر ضروری مفروضوں اور تصوروں کو یکے بعد دیگرے خارج کر دیا گیا اور اس کی بنا مشاہدہ پذیر تصورات پر رکھی گئی ہے۔ اس دعوے کی تصدیق کیلئے بعض تفصیلات پیش کرنا ضروری ہیں۔

ایک تصور جو انیسویں صدی کی سائنس میں بڑی شدت کے ساتھ رائج ہو گیا وہ ایک ہمہ گیر ایتھر کا تھا جس کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ ساری کائنات اور فضائے بسیط میں چھایا ہوا ہے اور مادہ کے اندرونی مسامات میں بھی پایا جاتا ہے۔ روشنی اور برق و مقناطیس کے اثرات اسی ایتھر کے ذریعہ پھیلتے ہیں اور تمام اجرام فلکی اس میں سے حرکت کرتے ہوئے گذرتے ہیں۔ غرض کہ سائنس دانوں کا یہ بڑا مقبول تصور تھا حالانکہ یہ دیکھا گیا تھا کہ اگر ایتھر واقعی یہ سارے فرائض انجام دیتا ہے تو اس کی خاصیتیں بے حد متضاد ہونی چاہئیں۔ یعنی بیک وقت وہ نرم بھی ہو اور فولاد سے زیادہ سخت بھی، لچکدار بھی ہو اور بے لچک بھی، پھیلتا بھی ہو اور سکڑتا بھی۔ سائنس داں مانتے تھے کہ ایتھر کی یہ خاصیتیں ناقابل فہم ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ایتھر کو سینے سے لگائے بیٹھے تھے کیونکہ ان کی دانست میں بغیر ایتھر کو مانے ہوئے کام نہیں چل سکتا تھا۔ ایتھر کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے جتنے تجربے کئے گئے ان سب کا نتیجہ منفی حاصل ہوا۔ خود ایتھر میں زمین کی رفتار کو معلوم کرنا ناممکن تھا۔ اس صدی کے آغاز میں آئن سٹائن نے اعلان کیا کہ ایتھر کا تصور غیر ضروری ہے اور اس کو ماننے سے سائنس میں پیچیدگیاں اور غلطیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ ایتھر کو مانے بغیر سائنس کو زیادہ سادگی اور صحت کے ساتھ تشکیل کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح ہر تعلیم یافتہ شخص جانتا ہے کہ قوت تجاذب کا تصور اور اس کا قانون نیوٹن کا بہت بڑا کارنامہ ہے لیکن آئن سٹائن نے اس قانون پر ایک کاری ضرب لگائی اور بتایا کہ سرے سے قوت کا تصور ہی غیر ضروری ہے اور علم حرکت میں اس غیر ضروری تصور کو داخل کرنے سے غلطیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اس نکتہ کو سمجھانے کیلئے ایک دو مثالیں پیش کرنا ضروری ہیں۔ ہم جانتے کہ دریا کا پانی بہتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے۔ کیا اس کی یہ سائنسی توجیہہ حق بجانب ہو گی کہ دریا کو سمندر سے عشق ہے۔ ہر سمجھدار شخص یہی کہے گا کہ یہاں قوتِ عشق کا تصور داخل کرنا غیر ضروری ہے۔ پانی کی خاصیت ہی یہ ہے کہ نشیب کی طرف بہے اور چونکہ سمندر پست ترین سطح پر ہوتا ہے اس لئے دریا کا پانی لازماً سمندر میں جا گرتا ہے۔ اسی طرح جب ہم پہاڑ کی چوٹی پر جانا چاہتے ہیں تو سیدھے چوٹی تک چڑھنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ پہاڑ کے اطراف چکر کاٹنا شروع کرتے ہیں۔ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ پہاڑ کی چوٹی سے کوئی قوت نکلتی ہے جو ہم کو چکر کاٹنے پر مجبور کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں بھی قوت کا مفہوم داخل کرنا

غیر ضروری ہے بلکہ حقیقت صرف اس قدر ہے کہ ہم اپنے لئے آسان راستہ اختیار کر رہے ہیں۔ آئن شٹائن کا بھی یہی کہنا ہے کہ تجاذبی قوت کا مفہوم داخل کرنا غیر ضروری بلکہ کائنات میں ہر شے اپنا آسان ترین راستہ اختیار کرتی ہے۔ عام نظریۂ اضافیت کا یہ ایک بنیادی اصول ہے جس کی بنا پر سیاروں وغیرہ کی جو حرکت حاصل ہوتی ہے وہ مشاہدہ کے عین مطابق ہے حالانکہ نیوٹن کے اصول سے ان مشاہدات کی توجیہہ غلط ہو رہی تھی۔

اقبال بتاتے ہیں کہ قرآن کریم نے بھی خارجی کائنات کی اسی مشاہدہ پذیر حیثیت پر زور دیا ہے اور اس طرح ایک پائیدار تمدن کی بنیاد رکھی ہے۔ قدیم تمدنی نظام اسی وجہ سے ناکام رہے کہ وہ حقیقت سے دور تھے اور ان کی بنیاد حقیقت کی بجائے محض خیالی نظام فکر پر تھی۔

اقبال نے خطبات کے صفحہ ۳ پر بتایا ہے کہ اس معاملہ میں حکیم برگسان بھی ان کی رائے سے متفق ہے اور برگسان وجدان کو محض ایک اعلیٰ قسم کا ذہن سمجھتا ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت اور تصدیق کے لئے ضروری ہے کہ برگسان کی تحریروں کا تجزیہ اور تشریح کی جائے۔ ہمیں توقع ہے کہ جو اہل قلم جدید فلسفہ اور خصوصاً برگسان کے نظامِ فکر سے بخوبی واقف ہیں اس نکتہ پر روشنی ڈالیں گے۔

باغی مرید

(اقبالؒ)

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دِیا بھی — گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ — مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن
نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا — ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن!

یومِ اقبال

اثرِ گردشِ ایّام سے کچھ کام نہیں
انقلابِ سحر و شام سے کچھ کام نہیں

اپنے اپنے ہی خیالات میں افراد ہیں گُم
شورِ ہنگامۂ اقوام سے کچھ کام نہیں

دردِ ملّت کے بیاں سے بھی سکوں ملتا ہے
زندگی کے غم و آلام سے کچھ کام نہیں

اب تو موقع ہی کہاں عاقبت اندیشی کا
محوِ آغاز ہیں انجام سے کچھ کام نہیں

روحِ اسلام نے گر دیدہ کیا ہے اتنا
صورت و ہیئتِ اسلام سے کچھ کام نہیں

سُن لئے ہیں جو کچھ اسلام کے زرّیں اصول
غش اُنہی پر ہیں، خود اسلام سے کچھ کام نہیں

نام قرآن کا تقریر میں لیتے ہیں ضرور
اور قرآن کے احکام سے کچھ کام نہیں

کوئی مقصد ہی نہیں شہرتِ ارزاں کے سوا
نام سے کام ہے اور کام سے کچھ کام نہیں

یومِ اقبال تو ہر سال منا لیتے ہیں
لیکن اقبال کے پیغام سے کچھ کام نہیں

اسدؔ ملتانی

یومِ اقبال پر چند خیالات

(۲۱ر اپریل ۱۹۵۱ء)

محترم میاں بشیر احمد صاحب، سفیر مملکتِ پاکستان متعینہ ترکی، اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

ہاں! اقبال کو یہاں "پھیلانا" میرا فرض بھی ہے۔ میری خوشی بھی۔ لیکن بھائی! ہم اقبال کا ذکر نہ کریں تو اور کیا کریں۔ ہم اقبال سے مالا مال ہیں۔ اسی نے تو ہمیں، ہم گرے ہوؤں کو جگایا، ابھارا، اٹھایا، دوڑایا۔ اسی کے خیالات کو لیکر ہم فخر سے دنیا کے کونے کونے میں اپنا سر بلند کئے جا سکتے ہیں۔ پچھلے دنوں مسٹر ایس۔ اے۔ واحد نے یومِ اقبال کے لئے میرا پیغام طلب کیا۔ اس کی ایک نقل آپ کو بھی بھیج رہا ہوں۔ آپ "کشتۂ اقبال" ہیں۔ سو یہ خیالات "مشترکہ" ہیں۔ انشاء اللہ ہم یہاں بڑی دھوم دھام سے یومِ اقبال منائیں گے اور کئی زبانوں میں اس کا ذکر ہوگا۔

محترم میاں صاحب کا پیغام، فخر و مسرت سے درجِ ذیل کیا جاتا ہے:۔

مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں یومِ اقبال کے لئے ایک پیغام بھیجوں۔ میرا دل پھولا نہیں سماتا۔ یہ میرے لئے کتنی بڑی عزت ہے۔ آج پاکستان میں یومِ اقبال منایا جا رہا ہوگا۔ وہ پاکستان جس کا تخیل پہلے اقبال کے ذہن رسا میں پیدا ہوا اور جس کا نصب العین آج بھی زیادہ تر اقبال ہی کے خیالات سے نشو و نما پا رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابھی ہمیں اقبال کو سمجھنا ہے۔ نہ صرف بچوں کو بلکہ بڑوں کو بھی اس کے معانی کی تہ تک پہنچنا ہے۔ میں خوشی سے اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ اگرچہ میں چالیس برس سے اقبال کا مطالعہ کرتا رہا ہوں مگر ابھی اقبال میں اتنا کچھ ہے جسے سمجھنے سے میں قاصر ہوں۔ یہ ظاہر ہے کہ اقبال کو کوئی شخص پوری طرح نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ اسے اپنے نفس میں جذب نہ کر لے۔ اسے اپنی حیات و خیالات کا جزو نہ بنا لے۔ نہ صرف اسے پڑھے بلکہ کم از کم کوشش کرے کہ ایک حد تک اس کے قول پر عمل کرے۔ یہ مشکل بھی ہے اور آسان بھی۔ اس کے لئے ہمیں ضرورت ہے کہ ہم اس عظیم الشان اسلامی نصب العین کے لئے شوق و عشق پیدا کریں جو اقبال نے ہمارے سامنے رکھا۔

میرے عزیز ہم وطنو! یہاں ترکیہ میں ہم بھی گذشتہ سال کی طرح آج یومِ اقبال منا رہے ہیں۔ پچھلے روز جب میں استنبول میں یحییٰ کمال بیاتلی سے (جو ترکیہ کا سب سے بڑا زندہ شاعر بلکہ بعضوں کے نزدیک پوری ترکی شاعری کا سرتاج ہے) ملنے گیا تو ہم دونوں بہت دیر تک اقبال کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے

ان کے سامنے مختصراً اقبال کا نظریۂ حیات بیان کیا۔ وہ اُسے سن کر بے حد محظوظ و متاثر ہوئے اور مجھ سے کہنے لگے "میرے عزیز دوست! اقبال کے ان خیالات نے میری روح کو منور کر دیا ہے، بلاشبہ اقبال کے خیالات سارے عالم اسلامی بلکہ تمام دنیا کے لئے ایک مشعلِ نور ہیں۔ لیکن یہ ہم پاکستانیوں کا فرض ہے کہ ہم اس مشعل کو دنیا کے سامنے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں برابر جلائے رکھیں!

بشیر احمد

اقبال

کو سمجھنا ہو تو مجلسِ اقبال کراچی کے جنرل سکریٹری

سید عبدالواحد صاحب کی گراں قدر کتاب

IQBAL, HIS ART AND THOUGHT

بزبان انگریزی کا مطالعہ کیجئے۔

قیمت مجلد -/8 روپے۔ غیر مجلد -/6/8 روپے

ملنے کا پتہ: شیخ محمد اشرف، کشمیری بازار۔ لاہور

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا!

امیر جماعتِ اسلامی سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اکتوبر ۱۹۵۰ء میں حکومت کے مسودہ دستورِ پاکستان کے خلاف لمبی چوڑی تقریر فرمائی۔ دورانِ تقریر میں کسی شخص نے حسب ذیل سوال کیا:

> آپ نے پاکستان کو اسلامی ریاست اس بنا پر مانا تھا کہ قراردادِ مقاصد پاس کر دی گئی تھی۔ لیکن اب جبکہ اس قرارداد کو لپیٹ کر رکھ دیا گیا ہے اور ایک غیر اسلامی دستور بنایا جا رہا ہے، کیا اب بھی اس ریاست کی وہی پوزیشن باقی رہے گی؟ کیا ایک غیر اسلامی دستور بن جانے سے یہ ریاست غیر اسلامی نہ ہو جائے گی؟

اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا:

> پاکستان کو جس چیز نے اسلامی ریاست بنایا وہ یہ چیز نہیں تھی کہ دستور ساز اسمبلی کے ممبروں نے قرارداد مقاصد پاس کر دی بلکہ یہ تھی کہ باشندگان پاکستان نے بالاتفاق مطالبہ کر کے اس قرارداد کو پاس کروایا۔ اسلئے ملک دستور ساز اسمبلی کے ممبروں کا نہیں ہے بلکہ پاکستان کے عوام کا ہے۔ عوام نے جب چاہا کہ ان کا ملک خدا کا ملک قرار پائے اور اس کا باقاعدہ اظہار انھوں نے اپنی آئینی زبان، یعنی دستور ساز اسمبلی کے ذریعہ سے کر دیا، تو یہ ملک فی الواقع اللہ تعالیٰ کی نذر ہو گیا اور ہماری ریاست ایک اسلامی ریاست بن گئی۔ اب اگر اس ملک اور اس ریاست کی نوعیت کو کوئی چیز بدل سکتی ہے تو وہ دستور ساز اسمبلی کے ممبروں کا کوئی فعل نہیں بلکہ پاکستان کے عوام کی مجموعی خواہش ہی بدل سکتی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ امیر جماعت اسلامی نے لفظوں کی سحر کاری سے بزعم خویش کیسی عمدہ پناہ تراشی ہے۔ اُس وقت اگر یہ پوچھا جاتا کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ قرارداد مقاصد کو باشندگان پاکستان نے بالاتفاق مطالبہ کر کے پاس کروایا ہے تو اس کے لئے شاید لفظی نزاع شروع ہو جاتی۔ لیکن اب ایک ایسی صورت سامنے آئی ہے جو اس مسئلہ میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ مختصر الفاظ میں مودودی صاحب کی دلیل یہ تھی کہ یہ صرف صاحبِ اقتدار طبقہ کے چند افراد ہیں جو ملک میں صالحہ نظام کو رائج نہیں ہونے دیتے، ورنہ یہاں کے جمہور مسلمان بالاتفاق یہی چاہتے ہیں کہ یہاں اسلامی نظام رائج ہو جس کی زمام اقتدار صالح افراد امت کے ہاتھ میں ہو۔ پنجاب کے الیکشن نے یہ موقع بھی بہم پہنچا دیا کہ اس امر کا بین ثبوت مل جائے کہ جمہور مسلمان فی الواقعہ اسلامی نظام کے خواہاں ہیں یا

یہ بات بھی مودودی صاحب نے محض اپنی بات کی پچ میں کہہ دی تھی۔ اس الیکشن میں اسلامی جماعت نے اپنے امیدوار کھڑے کئے۔ ان امیدواروں کا دعویٰ یہی تھا کہ اسلامی نظام کے لئے کھڑے ہوئے ہیں اور جماعت اسلامی کی طرف سے انھیں صالح ہونے کی سند بھی حاصل تھی۔ اگر مودودی صاحب کا یہ دعویٰ صحیح ہوتا کہ جمہور مسلمان اسلامی نظام کے خواہاں ہیں اور اس مقصد کے لئے انھوں نے قرارداد مقاصد بالاتفاق پاس کرا دی تھی تو اس کے ثبوت میں اتنا ہونا ضروری تھا کہ یہ جمہور مسلمان اسلامی جماعت کے نمائندوں کو ووٹ دے کر انھیں کامیاب بنا دیتے۔ لیکن ہوا یہ ہے کہ ان تمام نمایندوں میں سے صرف ایک شخص کامیاب ہو سکا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کم از کم پنجاب کے جمہور مسلمان اس کے خواہاں نہیں کہ وہاں اسلامی نظام قائم ہو زمام اقتدار "صالحین" کے ہاتھ میں آئے۔ لہٰذا اس سے یہ واضح ہے کہ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے قرارداد مقاصد جمہور مسلمانوں نے بالاتفاق پاس نہیں کرائی تھی۔ اس بنا پر وہ اعتراض اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے جو مودودی صاحب کی مذکورہ صدر تقریر کے دوران میں کسی صاحب نے کیا تھا، یعنی یہ ثابت ہو گیا کہ پنجاب اسلامی ریاست نہیں ہے۔ لہٰذا اب یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ جب پنجاب کی ریاست اسلامی نہیں رہی تو اس کے متعلق اسلامی جماعت کا کیا رویہ ہوگا۔

دیانت پسند نگاہوں میں یہ بات اتنی واضح ہے کہ اب جماعت اسلامی کیلئے اس الجھاؤ سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی لیکن آپ دیکھیں گے کہ اب اس کے امیر کوئی اور پینترا بدلیں گے۔ جس طرح مرزا صاحب قادیانی کی حالت تھی کہ جب ان کی ایک پیش گوئی غلط ثابت ہوا کرتی تھی اور لوگ سمجھتے تھے کہ اب یہ اپنے دعوے سے باز آجائیں گے تو وہ باز آنے کی بجائے دو پیشین گوئیاں اور کر دیا کرتے تھے۔ چونکہ جماعت اسلامی کی مطلب براری اسی سے ہو سکتی ہے کہ وہ پاکستان کو اسلامی ریاست قرار دیتے رہیں کیونکہ اس کے غیر اسلامی تسلیم کر لینے سے اس جماعت کے لئے الیکشن بازی کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، اس لئے اب یہ حضرات اسے اسلامی ریاست ثابت کرنے کیلئے کوئی اور دلیل گھڑ لیں گے۔

معاشی مجبوریاں بھی انسان سے کیا کچھ کراتی ہیں۔

اقبال اور قرآن

پر اپنی اپنی رائے

زیرِ نظر کتاب کیا ہے ایک نسخہ کیمیا ہے۔ کلامِ اقبال اسلامی تعلیم کا نچوڑ ہے اور اسی نچوڑ کو عارف بٹالوی نے قرآن حکیم سے استدلال کر کے بتایا ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ سب قرآن پاک کی تعلیم سے وابستہ ہے۔ اس کتاب کا ہر مسلم گھرانے میں نسخہ ہونا اشد ضروری ہے کیونکہ اس میں نظامِ زندگی کا بہترین لائحہ عمل ہے۔ (ہفتہ وار۔ ذوالقرنین (بدایوں)

اس کتاب میں چار عنوانات ہیں ان میں جا بجا قرآن مجید کی آیات اور کلام اقبال پیش کر کے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کلامِ اقبال قرآن مجید کا ہی عکس ہے اور اس کی وضاحت میں عارف صاحب ایک حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ وہ لوگ اس سے زیادہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو علامہ اقبال سے عقیدت و شیفتگی رکھنے کے ساتھ قرآن اور قرآن کے مطالب کو بخوبی سمجھنے کی قابلیت اور اہلیت رکھتے ہوں۔ (خاتونِ پاکستان۔ کراچی)

اس کتاب کے عنوانات کے ہر موضوع کے ضمن میں بہت سے ذیلی عنوانات ہیں جدید انکشافات اور قدیم دینی تاریخی اور علمی معلومات کے لحاظ سے کتاب قابلِ قدر ہے۔ کلامِ اقبال سے آگاہی کے ساتھ ساتھ پڑھنے والا اور بھی بہت کچھ قیمتی مواد حاصل کر سکتا ہے جسکو فراہم کرنے کیلئے بہت زیادہ تعداد میں بڑی بڑی کتابیں مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ (فیض الاسلام۔ راولپنڈی)

جناب عارف بٹالوی نے اقبال اور قرآن مرتب فرما کر علومِ اسلامیہ اور حضرت علامہ اقبال کے جواہر پاروں سے دنیا کو روشناس کیا ہے اور ایک ایسے زمانے میں جبکہ ملت اسلامیہ قرآن مجید کے دستورِ حیات کے مطابق زندگی کی تعمیرِ نو کے لئے سرگرداں ہے۔ (شعلہ۔ سرگودھا)

لائق مولف ملتِ اسلامی کا اصل علاج اور نسخہ احیا قرآنِ حکیم ہی کو مانتے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے اقبال سے انکی شیفتگی اور بھی گہری عقیدت کا درجہ رکھتی ہے۔ عجب کیا کہ یہی اخلاص دنیا اور آخرت میں مقبولیت کا باعث بن جائے۔ (قومی زبان۔ کراچی)

آپ کی کتاب اقبال اور قرآن پہنچی، کتاب واقعی قابلِ مطالعہ ہے۔ (آنریبل لیاقت علی خاں)

آپکی کتاب اقبال اور قرآن پہنچی اس کیلئے شکریہ۔ کتاب اور اس کی تحقیق قابلِ مبارکباد ہے۔ (محترم۔ گورنر جنرل۔ پاکستان)

ملنے کا پتہ:۔ کتاب لمیٹڈ۔ رابسن روڈ۔ کراچی

Time commands Business
LIMTON commands Time

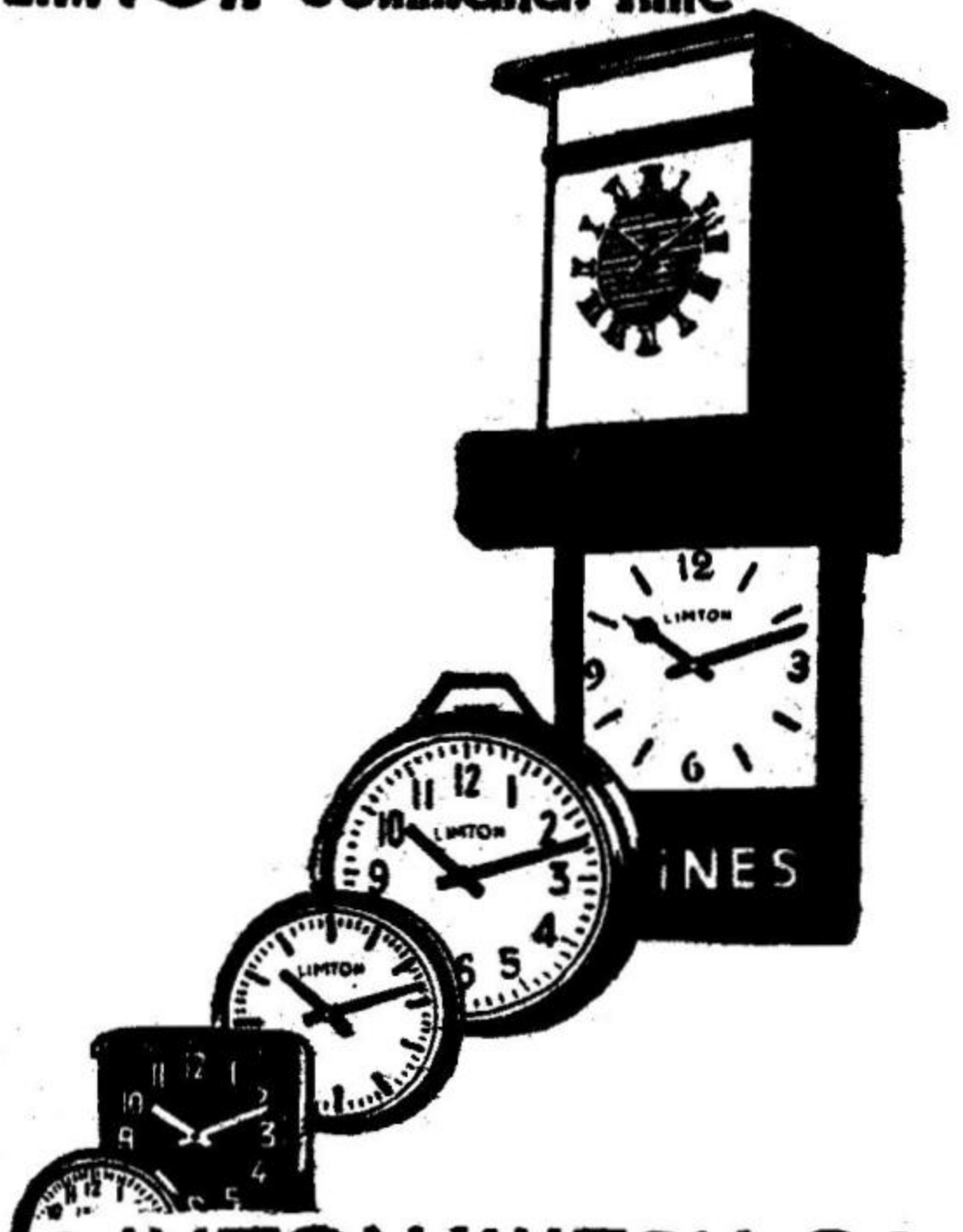

LIMTON WATCH CO

ELPHINS TONE STREET KARACHI.